Women Writ[ers]
Classics

سوری ممی

افسانے

عصمت چغتائی

RHOTAS LPS
Low Priced Series

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اول	1992ء
پرنٹرز	نفیس پرنٹرز بلال گراؤنڈ لاہور
پبلشرز	روہتاس بکس احمد چیمبرز - ٹیمپل روڈ لاہور

23-11-94

سوری ممی

عصمت چغتائی

روہتاس بکس

سوری ممی

ترتیب

سوری ممی 5

بہو بیٹیاں 16

کلو کی ماں 20

نیند 50

ننھی کی نانی 67

شخصیات جنہوں نے مجھے متاثر کیا 84

سوری ممی

آج پھر اس کے بنگلے میں ہلڑ مچا ہوا تھا۔ شوکیس کی طرح سجا ہوا ڈرائنگ روم روشنیوں سے جھلملا رہا تھا۔ زندگی کی امنگوں سے سرشار نوجوان جسم راک اینڈ رول کی ہیجان انگیز دھن پر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ بھاری بھرکم قہقہوں سے لپٹی ہوئی نازک، مہکی ہوئی کلکاریاں آس پاس کے بنگلوں میں رہنے والوں کو ہلکان کئے دے رہی تھیں۔ پوری کالونی پر گھمبیر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ صرف مسز مچل کا بنگلہ جاگ رہا تھا۔ بیویاں اپنے شوہروں کو خونی نگاہوں سے گھور رہی تھیں جن کی آنکھوں میں حسرت سسکیاں لے رہی تھی۔ سب اسے ممی کہتے تھے، مگر اس انداز سے جیسے اسے یہ مقدس خطاب دیتے وقت خود کو ماں کی گالی دے رہے ہوں۔ لوگ اس سے نفرت بھی کرتے تھے اور خائف بھی تھے۔ کیونکہ اس کا کافی رسوخ تھا۔ اس کی پارٹیوں میں بڑے بڑے بااثر لوگ فخریہ آتے تھے۔ اس وقت پونا کی فلم انڈسٹری عروج پر تھی پربھات کا بھرم قائم تھا۔ نو یگ چترپٹ نے لگاتار کئی کامیاب فلمیں دی تھیں۔ شالیمار فلمز کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔ ممی گروپ ڈانس کے لئے لڑکیاں سپلائی کرتی تھی۔ شہر بھر کی قبول صورت اینگلو انڈین لڑکیوں کی وہ لاڈلی ممی تھی۔ فلم میں کام کرنے کے شوقین نوجوان پونا آکر اسی کے بنگلے کا رخ کرتے کیوں کہ وہاں بڑے بڑے بمبئی اور پونا کے پروڈیوسر شام کو جمع ہوا کرتے تھے۔ ریس کے رسیا، چھوٹے موٹے راجہ، جنگ کے زمانے میں کمائی ہوئی اندھا دھند دولت کو چوگنا کرنے کے شوقین نو دولتیے اور ان کی دولت کو ٹھکانے لگانے والے گدھ! سب ہی کو وہاں سے فیض ملتا تھا۔

اور ممی کی لڑکیاں نہایت کلچرڈ اور حسین تھیں۔

ممی کی عمر پھولوں کی سیج پر نہیں کٹی تھی۔ اس کا شوہر جوکی تھا۔ رانیوں مہارانیوں کا مرضی داں۔ وہ بڑے فخر سے ان تمام رجواڑوں کے نام لیا کرتی تھی جہاں مسٹر مچل پر حسینائیں قربان ہوا کرتی تھیں۔ مگر وہ اپنی ڈورا پہ مرتا تھا اور اپنی چاہنے والیوں کے سارے تحفے اسے لا لا کر دے دیا کرتا تھا۔ ایک دن ایک بدذات گھوڑے نے اسے دے پٹخا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ ایک بنگلہ، مین بازار میں کچھ دکانیں، بند گارڈن کے قریب تھوڑی سی زمین اور نہایت قابلِ ذکر بینک بیلنس چھوڑ کر مر گیا تھا۔

مسز مچل میاں کے غم میں دیوانی ہو گئی۔ دل کی وحشت کم کرنے کے لئے اس نے ان گنت عشق کئے پر مسٹر مچل کا نعم البدل نہ پایا۔ جوانی کے زمانے میں نہ جانے کتنوں نے اس کے لئے جانیں دیں۔ بدقسمتی سے میں اس کے کسی بھی پرانے عاشق کو نہ پہچان پائی۔

جب عمر نے بے وفائی کی اور عاشق مر گئے تو مسز مچل کا بنگلہ پھر سونا پڑنے لگا، مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ بجائے اپنی ہمعمر اترتی ہوئی بوڑھیوں کے اس نے کم عمر لڑکیوں سے دوستانہ بڑھایا۔ عاشق اور معشوق کو ملانے میں بہت فائدے تھے۔ ایک تو مِس کا بنگلہ نوجوانوں کے پیار کی گرمی سے منور رہنے لگا، دوسرے کبھی رشوت میں یا مروت میں اس پر بھی کوئی مہربان ہو جاتا۔ وہ بڑے چاؤ سے اس بھیک کو کلیجے سے لگا لیتی۔ کمسن اور ناتجربہ کار عاشق کے بڑے چاؤ چونچلے کرتی، اور جب اسے کوئی نوجوان تیتری اڑا لے جاتی تو وہ از سر نو بیوہ ہو جاتی درو دیوار کو خودکشی کی دھمکیاں دیتی، کئی کئی دن آنکھیں سجائے، منہ لٹکائے پھرتی۔ مگر صحت اچھی تھی، لوٹ پوٹ کے پھر مستعد ڈٹ جاتی، سر سے پیر تک کھنڈر کی مرمت کر ڈالتی۔ بالوں کا شیڈ بالکل بدل ڈالتی، بھوؤں کے زاویے اور خم بھی بدل دیتی اور زیادہ شوخ اور جاگتے ہوئے کپڑے بنوا لیتی۔ کیونکہ مفت کی شراب ملتی تھی، نیا محبوب ملنے میں کچھ زیادہ پل بیل نہیں لگانے پڑتے تھے۔ نئے کبوتر کے پھنستے ہی وہ دھوم دھام سے اپنا جنم

دن منا ڈالتی۔ کون یاد رکھتا کہ وہ سال میں کتنی بار پیدا ہوئی تھی۔ دل کا ٹوٹنا بھی تو ایک موت ہے۔ اور اس کا دل ربڑ کا بنا ہوا تو تھا نہیں جو ٹھوکے کھا کر رہ جاتا۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے ان ٹھوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی۔ جب زندگی بوجھ بن جاتی وہ شرمائی شرمائی، مسکراتی ہوئی گھر گھر اپنی برتھ ڈے کے بلاوے بانٹنے لگتی۔ لوگ بمبئی سے اس کا جنم دن منانے آتے کیونکہ مسز مچل کی پارٹیاں بے حد پرلطف ہوتی تھیں۔ دکھیا ادھیڑ عمر کی تھیں مگر نہایت شوخ بچیوں کی طرح اٹھلاتیں، ٹھنک کر بات کرتیں، نہایت بچگانے کپڑے پہنتیں۔ پہلی نظر میں بالکل لونڈیا سی نظر آتیں۔ غور سے دیکھنے پر ان کے چہرے کا روڑھاپن قدرت کی کوئی نہایت بھونڈی حماقت معلوم ہوتا تھا۔

بے حد خوش مزاج تھیں۔ بات بات پر کلکاریاں مارتیں اور سونے کے تاروں میں جکڑی ہوئی بتیسی ایسی فراخ دلی سے نکوس دیتیں کہ تصنع کا شبہ بھی نہ ہوتا۔ نہایت ڈھیٹ واقع ہوئی تھیں۔ جن بیویوں کے شوہروں کو گرل فرینڈز مہیا کرتیں ان سے بہناپا جوڑنے پر مصر رہتیں۔ کوئی کتنی بھی سرد مہری اور بے مہری برتتا، نہایت بے رحمی سے دھتکار دیتا مگر وہ بغیر پلک جھپکائے صدقے واری ہوئے جاتیں۔ ایک میں ان سے بڑے تپاک سے ملتی تھی تو وہ مجھے نہایت احمق اور بیچ ذات سمجھتی تھیں کیونکہ تمام شریف زادیاں انہیں کمتر سمجھتی تھیں۔

"ہاں بابا ہم تو پکا سنر (SINNER) ہے۔ ایک دم hell میں جائے گا۔" وہ بڑے وثوق سے دعویٰ کرتیں۔ انہیں اپنے گناہگار ہونے پر رسمی طور پر بھی ندامت نہیں تھی۔ بلکہ کچھ فخر ہی تھا۔ گناہ اور جوانی کا پرانا رشتہ ہے۔ اگر جوانی سے رابطہ قائم رکھنا ہو تو گناہ کی لعنت مجبوراً جھیلنا پڑے گی۔

مسز مچل کو لڑکوں نے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا اور ایک حلقے میں لیفٹ رائٹ کر رہے تھے۔ وہ ان جوان کندھوں پر سرخ انگارہ پھسلواں فراک میں شعلہ فشاں تھی۔ اس کے سرخ بال گاڑھے گاڑھے خون کے لوتھڑوں کی طرح برہنہ کندھوں پر بہہ رہے تھے۔ سنہری روپہلی دانت یہاں سے وہاں تک چہرے پر

بکھرے جگمگا رہے تھے۔ یکساں اس کے حلق سے مسرت کی چینیں اچھل اچھل کر سوئی ہوئی کالونی کو چونکا رہی تھیں۔

ممی کو آزادی سے اس شریفوں کی بستی میں دھندا کرنے کی اجازت صرف اس لئے ملی ہوئی تھی کہ اس کی کلائنٹس سب اینگلو انڈین تھیں جو دیس کی لاج نہیں سمجھی جاتیں۔ شاید اس لئے کہ وہ قابل نفرت سفید قوم کی گھناؤنی حماقتیں تھیں۔ ساری یا غرارے میں اس کے ہاں کسی حسینہ کو کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اس معاملے میں وہ بڑی سخت تھی۔ اس کی پارٹیوں میں شرکت کے لئے لازمی تھا کہ فراک' اسکرٹ یا جین پہنی جائے۔ گھریلو جھاڑ جھنکاڑ بیویوں سے اکتائے ہوئے اصحاب کو مسالہ بھی چٹپٹا اور مختلف ذائقے کا ملتا۔

مسز مچل مجھے تھرڈ ریٹ سمجھتی تھیں پھر بھی اپنے دکھڑے سنانے میری ہی جان پر نازل ہوتیں۔ انہیں عام بیویوں سے بڑی شکایت تھی کہ وہ ان سے تپاک سے نہیں ملتیں۔ خاص طور پر مسز ورما کو تو وہ کسی طرح نہیں سمجھ پاتی تھیں۔

ورما جی نو یگ چترپٹ میں اپنی اٹھارویں یا بیسویں فلم ڈائرکٹ کر رہے تھے۔ نوخیز اداکاروں میں وہ بہت پاپولر تھے۔ انہوں نے کتنی ہیروئنیں بنا کر پھینک دی تھیں۔ پتھروں کو بھی چھو دیتے تو وہ تارہ بن کر آسمان پر جگمگانے لگتے: دور------ ان کی پہنچ سے بہت دور۔ جتنی ہیروئنیں وہ بناتے گئے ان کی قسمت بگڑتی گئی۔ کوئی لڑکی ان کی نظروں میں بچ جاتی تو پہلے تو وہ خود اس پر بے طرح ٹوٹ کر عاشق ہو جاتے' پھر اسے گھس گھسا کر ہیروئن سے بھی آگے بڑھا دیتے۔ اس مرحلے پر وہ آگے پیچھے کچھ نہ دیکھتے۔ پروڈیوسر سے لڑ بیٹھتے' کیمرہ مین سے جوتم پیزار کی نوبت آ جاتی' ہیروئن برگشتہ ہو جاتی' ہیرو ان کے خون کا پیاسا ہو جاتا' سارا اسٹاف انہیں گالیاں دیتا مگر وہ اسے چوٹی پر پہنچا کر ہی دم لیتے۔

اور چوٹی پر پہنچنے کے بعد وہ انہیں کے ایسی لات جڑتی کہ یہ لڑھکتے ہوئے نیچے آن گرتے۔ وہ ان کی داشتہ بن کر رہ چکی ہو پھر بھی نہایت پارسا اور کنواری بن جاتی' ان کی خرمستیوں کی تفصیل بیان کر کے قہقہے لگاتی۔ اس کی معصومیت کا قائل

ہونا پڑتا کیونکہ اس کی مارکیٹ بن چکی ہوتی۔ اور فلم انڈسٹری میں جس کی مارکیٹ بن جائے وہ مائی باپ بن جاتا ہے۔

مسز ورما ادھیڑ میاں کی ادھڑی ہوئی بیوی اور چار بچوں کی نہایت کڑوی کسیلی ماں تھیں۔ وہ ان گنت ہیروئنیں جھیل چکی تھیں۔ ان کی خودداری گھس پٹ کر کبھی کی خاک میں مل چکی تھی۔ ورما جی عروج کے زمانے میں' یعنی جب ان کی فلم سیٹ پر ہوتی' بڑے ٹھاٹ سے ہوٹل میں رہتے۔ بدنامی سے بچنے کے لئے نوخیز ہیروئن کو ایک الگ کمرے میں رکھتے۔ اس کے شاہانہ اخراجات پروڈیوسر کے سر تھوپے جاتے۔ اپنی ساری تنخواہ مسز ورما کو تھما دیتے اور وہ ضرورت سے زیادہ کھلواڑے سے ایک اجاڑ سے گھر میں سب پیسے دبا کر بیٹھ جاتیں۔ اتنی احتیاط رکھتیں کہ گھر اسٹوڈیو کے قریب ہی ہو تاکہ اگر تنخواہ آنے میں ذرا بھی دیر ہو تو وہ اپنی ملگجی' مصنوعی ریشم کی بھدیلی ساڑھی اور لتیڑ کولہا پوری چپل پھٹکارتی مجبور و مظلوم بیوی کا روپ دھارن کر کے وہاں پیدل پہنچ سکیں۔ اچھا ہے اگر ساتھ میں ایک عدد ناک بہتا مرگھلا سا بچہ بھی ہو۔ ورما جی اس ڈرامے سے بہت لرزتے تھے اور حتی الامکان پکار پہنچانے میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔

مسز مچل سے ان کے پرانے تعلقات تھے۔ جب وہ اپنی پہلی فلم بنا رہے تھے تو انہیں نصف ہیروئن تو بنا ہی ڈالا تھا۔ گو اب وہ پیار میں ممی کہتے تھے مگر انہیں جب کسی نئی چھوکری کی ضرورت ہوتی تو اب بھی فلرٹ کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ وہ بھی انہیں دیکھ کر تتلانے لگتی تھیں۔ حساب سے مسز ورما کی اصلی سوتن مسز مچل تھیں۔ باقی آفتیں انہیں کے وسیلے سے ملی تھیں۔

مگر یہ نئی آفت' جو مسز مچل نے سال بھر ہوا ورما جی کے سر تھوپی تھی' ان کے لئے وبال جان ثابت ہو رہی تھی۔ وہ ہوٹل میں رہنے پر قانع نہیں تھی' باقاعدہ شادی پر مصر تھی۔ مسز مچل کو ان لڑکیوں سے سخت نفرت تھی جو ہوم فرنٹ پر حملہ کرتی ہیں۔ سویلین آبادی پر بمباری کرنا قانون شکنی ہے۔ پیسہ لو' پیار لو' مگر کسی کے گھر کا کھونٹا نہ اکھاڑو۔ کبھی نہ کھونٹا اتنا گہرا گڑا ہوتا ہے کہ زیادہ زور مارو تو بیچ

سے ٹوٹ کر آدھا ہاتھ آ جاتا ہے آدھا ادھر بھی گزارہ جاتا ہے' اور یہ ادھورا کھونٹا بیچ سڑک پر تھکے ہارے بیل کی طرح بیٹھ جاتا ہے' اور یہ ریزہ ریزہ بیل عشق و محبت کی گاڑی بھلا کیا کھینچ سکے گا! جب لوگ عشق نہ کر پائیں گے تو مسز مچل کی پارٹیوں کا نور کہاں سے آئے گا۔

اس لئے وہ جی جان سے یہی کوشش کرتی تھی کہ کھونٹا اپنے استھان پر مستحکم گڑا رہے' پیار کا لین دین چلے' ایک سے ایک نمبرون ہیروئن تعمیر ہو۔ اسی لئے اسے معمولی شکل و صورت کی لڑکیوں سے نفرت تھی۔ فلم میں ہیروئن نہیں بن پاتیں تو کسی کے گلے میں لٹکنا چاہتی ہیں تاکہ اس پر زور ڈال کر ہیروئن بنی رہیں۔ لوگ اس کے بنگلے میں دلہنیں ڈھونڈنے نہیں آتے بلکہ جان لیوا دلہنوں سے پنڈ چھڑا کے دو گھڑی ہنسنے بولنے آتے ہیں۔ مسز ورما کی نئی آفت' مس روپا' صرف شادی ہی پر مصر نہ تھی اس نے ورما جی کا مسز مچل سے میل جول بھی ختم کرا دیا۔ وہ انہیں ایسی جگہ کیوں جانے دیتی جہاں سے خود اس نے انہیں بٹورا تھا۔

اگر مس روپا جیت گئی تو دوسری چھوکریوں کو اور شہ ملے گی' اس لئے مسز مچل اس کی کاٹ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ یہ وہ جانتی تھی کہ مسز ورما اتنی ڈھیلی نہ ہوتیں تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی' لہٰذا اس نے انہیں کسنے کا تہیہ کر لیا۔ مگر مسز ورما نے اسے بری طرح دھتکار دیا۔

"تم بھی حد کرتی ہو۔ خود ہی آگ لگائی اور آپ ہی بجھانے دوڑیں۔" انہوں نے مجھ سے مسز ورما کے برتاؤ کی شکایت کی تو میں نے جل کر کہہ دیا۔

"او کے۔ ہم کنڈم بات کیا۔ پر بابا اب ہم بولتا نا ہم سوری ہے۔ ہمارے کو کیا پتا تھا وہ سالی ایڈنا ایک دم ہلکٹ ہے۔" روپا کا اصلی نام ایڈنا ڈی سلوا تھا۔ نہایت سنجیدگی سے مسز مچل نے ایک نہایت شاندار پروجیکٹ کا پلان بنایا۔ فوراً ورکنگ کمیٹی کا صدر' اعزازی سیکرٹری اور خزانچی مجھے چن لیا' کیونکہ مسز ورما مجھے نہیں دھتکار سکیں گی۔ ان اعزازی عہدوں کو حاصل کرنے کے بعد یہ میرا فرض ہو جاتا ہے کہ میں مسز ورما کی اوور ہالنگ کرواؤں۔

"دیکھئے نا میرے صوفے کا کیا حال ہو رہا ہے۔ مرمت کروانے کی توفیق نہیں ہوتی بھلا مسز ورما کی مرمت کیا کروا سکوں گی۔"

"چہ' ارے بابا اس میں کیا واندا ہے۔" انہوں نے مجھے سمجھایا کہ یہ میرا اخلاقی فرض ہے کہ میں انہیں منی کیورنگ پیڈی کیورنگ کے لئے راضی کراؤں' ان کی ڈھلکی ہوئی لٹوریوں کو پرمانٹ ویو میں جکڑواؤں اور ان کے تھیلا ایسے جسم کو قابو میں لانے کے لئے اس درازی سے بلاؤز سلوانے پر آمادہ کروں جو ایک بلاؤز بائیس روپے میں سیتا ہے۔ تمام چوٹی کی فلم ہیروئنیں اسی درزی سے قہر بداماں بلاؤز سلواتی ہیں کہ کلوز اپ دیکھتے ہی سنسر کی قینچی پھڑک اٹھتی ہے۔

ایسے قینچی چلاؤ بلاؤز سے مسز ورما کے جسم کا جھول تو نکل جائے گا مگر ان کی روح پر پڑی تہہ بہ تہہ شکنیں کون مٹا سکتا ہے۔ ورما جی کی پرانی ہیروئن سازی کی لت نے ان کی خودداری کو اتنی ٹھوکریں ماری ہیں کہ وہ صرف ملبے کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہیں۔ اس کا انتقام بس وہ ایک طریقے سے لیتی ہیں کہ انہیں بجائے انسان کے روپیہ کمانے کی مشین کا مرتبہ دے رکھا ہے۔ مشین کو رجھانے کے لئے سولہ سنگھار کون کرے۔ دو چار پیچ ہیں جنہیں کستے رہیں تو کھٹا کھٹ چلتی رہتی ہے۔

جیسے بہت سے مردوں کو عورت کو قابو میں لانے کے گر معلوم ہوتے ہیں اسی طرح مسز مچل اپنے آپ کو مردوں کو پھانسنے کے فن میں ماہر سمجھتی تھیں اور ہر وقت اپنے آزمودہ نسخے حلق سے اتارنے پر تلی رہتی تھیں۔ آس پاس جتنے بھی فلم لائن میں کام کرنے والے تھے وہ ان کی بیویوں کو جا کے بے حد دہلاتیں کہ یہ فلم لائن ہے' یہاں کسی کا میاں محفوظ نہیں۔ مال کی طرف سے چوکس رہو۔ قدم قدم پر پھسلن ہے۔ شریف سے شریف شوہر کا پیر رپٹ جاتا ہے۔ شوہر لوگ کو قائم اور دائم رکھنے کے لئے بڑے جوڑ توڑ کی ضرورت ہے۔ جس اسلحے کے بل پر غنیم نے میدان جیتا ہے وہی جدید ترین ہتھیار استعمال کرنا چاہئیں۔ جہاں ہم اور باتوں میں پچھڑے ہوئے ہیں شوہروں کی رکھشا کا پروگرام بھی نہایت گھس پٹا ہے۔

ولایت میں کس قدر تیر بہدف سنگھار کے سامان' تیل ' چھوٹے

بڑے کپڑے تیار کیے جاتے ہیں۔ دلربا پاؤڈر، دل کش لپ اسٹک اور شوہر پھانس کریمیں۔ جب ہی تو فلمی لڑکیاں ہمارے مردوں کو لے اڑتی ہیں، مگر یہاں کی لڑکی ولایتی کو نہیں گھیرپاتی۔

بھلی بیبیاں لرز اٹھتیں اور فوراً مسز مچل کی رائے سے ہتھیار بندی شروع کر دیتیں۔ کہنے والے کہا کرتے تھے کہ دکان دار انہیں کمیشن دیتے ہیں۔

اور میں نہایت مرعوب یہ سوچا کرتی تھی کہ اتنی ذہین، عورت کی ساری صلاحیتیں ایک قحبہ خانے کو چلانے میں ضائع ہو رہی ہیں۔ لوگو! اسے کسی ملک کا وزیر دفاع کیوں نہیں بنا دیتے۔

جب مسز ورما نے ان کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیں تو انہوں نے پیشین گوئی کی کہ بہت جلد مس روپا ورما جی کو سموچا نگل جائے گی اور ڈکار لینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرے گی۔

مگر حالات نے ایک دم سے پلٹا کھایا۔ مسز روپا نے عین وقت پر گیئر بدل دیا ورنہ مسز ورما کی دنیا سرمہ ہو کر رہ جاتی۔ ہیرو کی گرل فرینڈ عورتوں کی ازلی بیماری کے سلسلے میں اسپتال گئی۔ یہ غیر حاضری کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کی وجہ سے ذرا طویل ہو گئی۔ اکتا کر وہ مس روپا پر مسکراہٹیں بکھیرنے لگا۔

فلم کی رپورٹ کچھ ٹھنڈی تھی۔ مس روپا کو اب تک کوئی اچھا آفر نہیں ملا تھا۔ ورما جی اپنی قبر کافی گہری کھود چکے تھے۔ ان کے ساتھ دفن ہونے کا اسے قطعی کوئی شوق نہیں تھا اس لئے وہ بھی ہیرو پر ٹوٹ پڑی جس کی مارکیٹ اچھی تھی۔

ورما جی فوراً الف ہو گئے اور دھڑا دھڑ اس کے کلوز اپ کاٹنے لگے۔ پکچر اڑ گئی اور ورما جی ہوٹل کے بلوں سے نہ جوجھ سکے اور بوکھلا کر مسز ورما کے آنچل کی اوٹ لے لی۔ انہیں دنوں فلم انڈسٹری نے بھی گیئر بدل ڈالا۔ مدراس کی ایک فلم "چندر لیکھا" نے باکس آفس کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں اور مدراس کی فلم انڈسٹری ایک دھماکے سے میدان میں اور جھنڈے گاڑنے لگی۔ اشرفی نے دونی چونی کا تختہ لوٹ دیا اور پونا کی فلم انڈسٹری کی چولیں ڈھیلی ہونے لگیں۔ ساری کمپنیاں ایک ایک کر کے

دم توڑنے لگیں۔ پربھات کی قرنا بجانے والی کا ٹریڈ مارک غائب ہو گیا۔ نو یگ چترپٹ میں تالا پڑ گیا۔ شالیمار نے بستر بوریا سمیٹ کر ہجرت کر لی۔ پکچر کے ساتھ ساتھ مس روپا کے مستقبل پر بھی تالا پڑ گیا۔ ہیرو کی گرل فرینڈ کی بیماری کی پیچیدگیاں ایک موٹے تازے بیٹے کی صورت اختیار کر گئیں اور وہ مجبوراً" ایک فرماں بردار باپ بن گیا۔ غریب نہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ ملک چھوڑ کر رخصت ہوتے ہوئے ناموں کی عنایت سے اس نے بمبئی میں ایک دو کمرے کا اونرشپ والا فلیٹ خرید لیا اور سیکنڈ ہیروئن کے رول کرنے پر تیار ہو گئی۔

فلم انڈسٹری کی بھگدڑ کے سلسلے میں ورما جی بھی اپنا ٹاٹ پلان بٹور کر دادر آ گئے۔ میرا بھی پونہ سے ناتہ ٹوٹ گیا۔ ممی ایک چمکتی ہوئی دلچسپ یاد بن گئی۔ کبھی ادھر ادھر سے خبر مل جاتی کہ بڑی ڈیسپریٹ ہو گئی ہے۔

پھر سنا ممی ایک نہایت سنگین لفڑے میں پھنس گئی۔ اس کا بنگلہ سونا رہنے لگا تھا۔ بس ریس کے شوقین لوگوں کا آسرا رہ گیا تھا۔ کبھی مہا بلیشور یا پنچ گنی آؤٹ ڈور کی شوٹنگ پر جاتے آتے اس کے پرانے مداح وہسکی اور سوڈے کی پیٹیاں لے کر اس کے یہاں دم لینے کو رک جاتے۔ ممی فوراً اپنا جنم دن منا ڈالتی۔ ایک دو راتیں جگمگا اٹھتیں۔ پھر رنگ کے غبارے پھٹتے۔ ممی بدمست کندھوں پر چڑھ کر کلکاریاں مارتی۔

پھر راہ گیر اپنی راہ لگ جاتے، غبارے پچک جاتے، نیون کی بتیاں دم توڑ دیتیں اور وہ خالی بوتلیں اور ٹین پیچ کر انڈوں اور ڈبل روٹی والے کے تقاضوں کا بوجھ کم کرتی۔

اس کے کپڑوں کے رنگ دھل دھل کر پھیکے پڑنے لگے۔ حد تو یہ ہے کہ سرخ بالوں میں چاول چمکنے لگتے اور ہیر ڈریسر کا دل نہ پگھلتا۔ کم بخت کو ممی نے کتنے گاہک دلوائے تھے اپنے عروج کے زمانے میں۔ پنچ گنی جاتے ہوئے ایک بار میری اس سے دو گھڑی کو ملاقات ہوئی۔ بڑی گھسی ہوئی لگ رہی تھی کہ اسے ممی کہتے ہوئے ماں کی گالی کا احساس نہیں ہوا۔

اسی لئے جب سنا کہ وہ لفڑے میں پھنس گئی ہے تو کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا۔ لڑکیاں پہلے سے کھلے بندوں سپلائی کرنے لگی تھی۔ گو اب اچھا مال بمبئی کی طرف رل آیا تھا اور اس کے پاس خوش شکل آیاؤں کا اسٹاک رہ گیا تھا۔ انہیں بھی وہ بڑے سلیقے سے کانٹ چھانٹ کے طرح دار بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ممی کی گرلز اب چھوکریاں کہلانے لگی تھیں۔ ان میں سے کئی گروپ ڈانس یا اول درجے کی ایکسٹرا میں چانس دینے کے قابل ہو گئی تھیں۔

ایک پھٹی ہوئی ریاست کے سرنگوں راجہ کا دل ایک کانوینٹ کی لڑکی پر آ گیا۔ مصاحبوں نے ممی سے رجوع ہونے کی صلاح دی کہ وہ کسی زمانے میں دل بستگی کی ٹھیکے دار رہ چکی تھی۔ اپنے فن کو اب بھی نہیں بھولی تھی۔ آفرین کر ممی لرز اٹھی۔ لڑکی کسی بارسوخ افسر کی تھی: نابالغ اور بلا کی حسین، مگر معاوضہ معلوم کر کے اس کی رال ٹپک پڑی۔

بڑی ردو قدح کے بعد طے ہوا کہ لڑکی مل سکتی ہے۔ صرف دیکھنے کے لئے، برتنے کے لئے نہیں۔ عاشق نے حامی بھر لی اور ایک بار پھر ممی کا بنگلہ جی اٹھا۔ نوٹ نیا نیا نکلا تھا اور وہ نوخیز کلی جب اپنے کچے جسم کو twist کرتی تو اچھے اچھوں کے دل مروڑ کے رکھ دیتی۔

وہ راجہ کا بچہ الو کا پٹھا شرافت اور انسانیت کے سارے اصول توڑ کے اسے لے بھاگا۔

"ہم کو للی بولا مسز پچل ایک دم تھرڈ کلاس براتھل والا نام لگتا ہے۔ پھر ہم جب تہران گیا تو ہم کو شہناز بہت اچھا لگا۔ ساؤنڈ بھی اچھا کرتا ہے۔"

"تہران بھی ہو آئیں؟"

ارے ہم وہاں ساڑھے تین سال رہا۔ ہم نے فارسی بولنا بھی سیکھا: من نمی دانی، شما نمی دانی۔" وہ میرے اوپر فارسی کا رُعب جھاڑنے لگی۔

"ٹھیک کہتی ہو، واقعی من ہیچ نمی دانم لیکن شما ہمہ دانی۔"

"لیس لیس۔" وہ حسب عادت کلکاریاں چھوڑنے لگی۔

میرے دل میں بھی کھدبد ہو رہی تھی اور وہ بھی اپنے کھلونے دکھانے کے لئے بے قرار تھی۔ ڈریسنگ روم میں چاروں طرف الماریاں جڑی ہوئی تھیں جو قسم قسم کے لباسوں سے اٹا اٹ بھری تھیں۔ وہ ان کی خوبیاں اور قیمتیں بتاتی رہی۔ درازیں کاسٹیوم جیولری سے بھری پڑی تھیں۔ سینڈلوں کی قطاریں براجمائے کھڑی تھیں۔ اتنے بڑے بڑے فیس کریم کے جار اور سینٹ کے قرابے تو شاید "صاحب سنگھ" میں بھی نہ ہوں گے۔ تین آئینوں والی ڈریسنگ ٹیبل ایسی لبالب بھر رہی تھی کہ تل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔

"یہ الہ دین کا لیمپ کہاں سے مل گیا، میڈم شہناز؟" میں نے جل کر پوچھا۔ وہ بے تحاشا کوئل کی طرح کوکنے لگی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور ماتھے پہ انگلی مار کے بولی:

"بیڈ------ اور کچھ نہیں------ بیڈ مائی ڈارلنگ۔"

مجھے ایسے معلوم ہوا میرے سر کی جگہ ایک بٹن ٹنکا ہوا ہے۔ چار چھیدوں والا ننھا سا کانچ کا بٹن------ اور اسے سستے کانچ کے چھلنی بٹن پر وہ ساری کتابیں ٹوٹ پڑیں جو میں نے پڑھی تھیں۔ میں نے چاہا کانچ کے بکھرے ہوئے ذروں کو چن لوں، مگر میری انگلیاں لہو لہان ہو گئیں اور کرچیاں پوروں میں کھٹکنے لگیں۔

بیڈ روم سے ملحقہ کمرہ بالکل فیکٹری بنا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک بیضاوی آسمانی رنگ کا ٹب تھا۔ بیچوں بیچ ڈاکٹروں کے معائنے جیسا میز نما بستر لگا ہوا تھا جس پر ریکسین کا کور پڑا تھا۔ دائیں طرف کمر اور کولھوں پر سے زائد گوشت چھیلنے کی مشین ایستادہ تھی۔

"اس کمر پٹے سے ایک ڈم سلم باڈی ہو جاتا ہے۔" اس نے ایک پٹا کولھوں پر اڑایا اور بٹن دبا دیا۔ خمیری آٹا تھر تھرا اٹھا۔

"اس سے رگ پٹھے ٹائٹ ہوتے ہیں، ایک دم جوان کا ماقک! اور چربی بھی کٹتی ہے۔ یہ فیس مساجر ہے۔ رنکل مٹ جاتے ہیں۔" ایک پورا شیلف ہارمون کریموں اور رنگ نکھارنے کے ابٹنوں سے بھرا ہوا تھا۔ طرح طرح کے خضاب،

لوشن وغیرہ جن کے آڑے ترچھے فرنچ نام مجھ سے پڑھے بھی نہیں گئے۔

مختصراً" اس نے بتایا کہ للی ڈرالنگ کی سرپرستی اور سرمائے سے اس نے یہ بیوٹی پارلر کھول رکھا تھا۔ بالکل جیسے موٹر کے کارخانوں میں ٹوٹی پھوٹی موٹروں کی مرمت کی جاتی ہے ویسے ہی یہاں گھسی پٹی، پنجر ڈھیلے، چربی سے لدی پھندی خواتین کی مرمت کی جاتی ہے۔ ٹھوک پیٹ اور روغن مالش کے بعد بالکل نئی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ "چھوکریوں کے دھندے میں صرف ماتھا پھوڑی ہے۔ مرد لوگ پیٹ کے بڑے ہلکے ہوتے ہیں۔ جب تک چار یاروں کے سامنے ڈینگیں نہ ماریں دام وصول نہیں ہوتے۔ پھر قانون کے ہاتھوں میں چل ہونے لگتی ہے اور تڑی پار ہونا پڑتا ہے۔ چھوکریوں سے تو چھوکرا لوگ اچھے ہوتے ہیں۔"

"کیا وہ مرد نہیں ہوتے؟" میں نے پوچھا۔

"ہوتے تو ہیں، مگر مرد میں اور چھوکرے میں بہت بڑا ڈفرنس ہوتا ہے۔" اس نے پھر ہنسی کی پچکاری چھوڑی اور آنکھوں میں خواب تیرانے لگی۔ "اور پھر کتنے نائی ہوتے ہیں! مگر کسی کے سامنے اپنی آمدنی کے متعلق ڈینگیں نہیں مار سکتے، کیونکہ جب عورت جسم فروشی کرتی ہے تو اسے لاچار، مجبور اور سماج کی ستائی کہا جاتا ہے، سب اس پر ترس کھاتے ہیں، مگر مرد ذات ایسا کرے تو لوگ اس سے گھن کھاتے ہیں۔ جبھی تو بے چارے کھلے بندوں قانون کی سرپرستی میں کوٹھے نہیں سجا پاتے۔

پھر وہ ایک دم اپنے پیارے "بوائز" کی فہرست گنانے لگی حالانکہ ان منحوس "بوائز" نے ہمیشہ نگوڑی کی لٹیا ہی ڈبوئی۔ ساری جائیداد ان ہی کے پیچھے غارت ہوئی۔ جو کچھ چھوکریوں کے ذریعے کمایا ان حرام زادوں پر پھونک دیا۔

یہ ایک اور قباحت ہے کہ لڑکیاں تو شادی کی تاک میں رہتی ہیں اور یہ شادی کے نام پر بدکتے ہیں۔ شادی جا کے شریف زادیوں ہی سے کرتے ہیں۔

"پر وکی بہت شور کر کے رویا۔" وہ اداس تھی مگر وکی کے رونے پر مسکرا پڑی۔

"لو بھئی، نگوڑا کاہے کو رویا؟" میں نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

"بولا ہم کو ساوی نہیں منگتا۔ ہم تم سے لو کرتا۔ سوسائیڈ کرے گا۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"ہم کیا کرتا؟ ہم بھی رویا۔"

پھر ایک دم چہک کر بولیں کہ وکی کی عورت پرگننٹ ہے۔ مارچ میں بے بی آئے گا۔

"تم بالکل جیلس نہیں ہوتیں؟"

"کیا بات کرتا؟ ہم کاہے کو جیلس ہووے؟ وہ ہر سال ہم کو کرسمس کارڈ بھیجتا۔ دسہرہ، ہولی ڈیز میں آیا...... اوہ! کتنا نائی ہے!" وہ بدن چرا کر اپنی ازلی کلکاریاں چھوڑنے لگی۔ پھر نہایت واہ کے سروں میں ایک ٹھنڈی میٹھی آہ بھری اور انگڑائیاں لیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے ان کا تخیلہ بھنگ کر رہی ہوں۔ سٹپٹا کر رہ گئی۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی کنکنائی اور وہ مصنوعی پلکیں پٹپٹا کر توتلی آواز میں اٹھلانے لگیں، جیسے ان کا چہیتا فون کے چونگے میں بیٹھا تھا۔ میرا جی کافی جھلس چکا تھا۔

"اچھا اب چلتی ہوں۔" میں نے اٹھنا چاہا۔

"اوہ، پلیز ٹھہر جاؤ۔ سندر آ رہا ہے۔" انہوں نے ایسے چہک کر کہا گویا میں سندر کے لئے بلک رہی تھی۔ پھر انگوٹھے اور کلمے کی انگلی کا چھلا بنا کر ہوا میں لہراتے ہوئے ایک آنکھ دبا کر بولیں: "اووف، کیا مست چھوکرا ہے۔"

جب وہ مجھے بس میں بٹھانے چلیں تو غنڈے انہیں دیکھ کر سیٹیاں اڑانے لگے۔ گو وہ عمر میں مجھ سے دس پندرہ برس بڑی تھیں مگر وہ سڑک کی یرقان زدہ روشنیاں اور ان کے نہایت نکیلے اور دھار دار کپڑے، ٹھمکا سا قد، روپہلی زلفیں، لوگ ضرور انہیں میری بیٹی سمجھ رہے تھے، یا شاید یہ سوچ رہے تھے کہ کوئی خوش قسمت نائکہ اپنی روٹی کا سہارا نوخیز اور طرح دار نوچی کو ٹھکانے لگانے جا رہی ہے۔

ایک دم گھڑوں احساس کمتری میرے کاندھوں پر رکھے ہوئے سستے کالج کے بٹن پر ٹوٹ پڑا۔ جی چاہا کہ اپنی برتری اور اس کی نیچتا کا اعلان کروں' ان احمقوں کو بتاؤں کہ میں ایک مقدس ادیبہ ہوں اور یہ ایک بوڑھی قحبہ ہے۔ دیکھ لینا حشر کے روز میں جنت میں جاؤں گی اور یہ دوزخ کا کندہ بنے گی۔

لیکن پھر یہ سوچ کر دل بیٹھنے لگا کہ اگر وہاں بھی یہی جھے بخرے بانٹنے والے ہوئے جو اس دنیا میں ہیں' جنہوں نے مجھے بسوں کے دھکے بخشے ہیں اور اسے امپالا تو میری چھٹی ہو جائے گی۔

"ذرا ہٹنا تو ڈارلنگ" کہتی ہوئی وہ فٹافٹ جنت میں داخل ہو جائے گی اور میں اپنا قلم جھلتی دھری رہ جاؤں گی۔

"وہ دیکھو' ادھر اندو رہتی ہے۔ نیپلس میں ملی تھی۔"

کٹے پر نمک چھڑکنے کو وہ اونچی اونچی عمارتوں میں رہنے والے اونچے اونچے دوستوں کے نام گنانے لگیں جن سے ان کی ڈانت کاٹی روٹی تھی۔ وہ انہیں ان کے پیار کے ناموں سے یاد کر رہی تھیں۔ وہ سب ان پر صدقے قربان تھیں۔

جل کے میں نے چاہا فوراً "سوشلزم" کی ٹٹی کے پیچھے دبک جاؤں۔ ایک زور دار بھاشن جھاڑنے لگوں کہ اس کے ہوش ٹھکانے کر دوں: (یہ اونچے محلوں میں رہنے والے سرمایہ دار غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ ان کے کردار پست' ضمیر کالے اور دل گناہ سے لبریز ہیں اور فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑنے والے کوڑھی اور مدقوق انسان بلند کردار والے ہیں۔ ان کے ضمیر روشن اور دل نور سے لبریز ہیں۔ یہی انسانی کے علم بردار ہیں کہ کنول ہمیشہ کیچڑ ہی میں کھلتے ہیں۔)

مگر یہ سوچ کر جی بیٹھ گیا کہ یہ اندھا دھند قسم کی عورت ٹھہری' کہیں یہ نہ کہہ دے کہ ڈیر! تب تو یہ خون چوس کر بڑی قربانی کر رہے ہیں کہ خود رانده درگاہ بن کر کروڑوں کو انسانیت کا علمبردار بنا رہے ہیں۔ دوسرے وہ اتنی سرشٹ بول رہی ہے کہ میری کاہے کو سنے گی۔

ابھی کچھ دن ہوئے مسز کپور کا فون آیا۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ میڈم شہناز کو غنڈوں نے پکڑ لیا۔ بڑی درگت بنائی غریب کی۔ ریت پر بے ہوش پائی گئی۔

اے ہے نگوڑی' میرا جی کٹ گیا۔ خدا غارت کرے ان درندوں کو۔ میں نے فون کیا تو اس کی آیا نے بتایا: "میم صاحب بہت بیمار ہے۔"

میں جب عیادت کو پہنچی تو اس کی عبرت ناک حالات دیکھ کر سن گئے رہ گئی۔ وہ اپنے ڈبل بیڈ پر ریزہ ریزہ بکھری ہوئی تھی۔ منہ خالی بٹوے کی طرح سکڑا ہوا تھا۔ تھوڑی ناک کی پھننگ سے لگی ہوئی تھی۔ رنگت جیسے مردہ چھپکلی۔ اس دن پہلی بار اس کے ذاتی بال دکھائی دیے۔ پیازی چندیا پر میلا میلا الجھا ہوا کچا سوت چپکا ہوا تھا۔ پہلے تو جی چاہا طعنے دے کے کلیجہ چھلنی کر دوں کہ کم بخت اور پھرو چھمک چھلو بن کے۔ بمبئی شہر میں عورت کی عزت ویسے ہی سوئی کی نوک پر ٹکی رہتی ہے۔

مگر جب وہ مجھے دیکھ کر بلک پڑی تو میرا بھی جی بھر آیا۔

"حرامی لوگ' سالا ایک دم موالی۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے پرسا دوں۔ جو عورت مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے تب بھی مسکراتی رہی کمینے غنڈوں نے اس نگوڑی کا کچومر نکال دیا۔ میرے دماغ میں بھیانک سین چکر لگانے لگے۔

"ہوا کیا؟" میں نے کچھ کہنے کی غرض سے احمقوں کی طرح پوچھا۔

"ہم ڈولی کا کور سیٹ اس کو دینے گیا۔" اس نے تھکی ہوئی بوڑھی آواز میں تفصیل بتائی۔ "ڈولی اکھا دن رمی کھیلتا۔ ہم بولا: "تم پیچھے رمی کھیلو پہلے یہ ٹرائی کر لو۔ بعد کو بولے گا چھوٹا ہے' بڑا ہے۔ فیر ہم کیا کرے گا؟ ہم فارین سے مال منگاتا ہے..."

"مگر... وہ غنڈوں نے جو..."

"او---و" ایک دم سے اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "سالا باسٹرڈ موالی لوگ!"

شرم اور غیرت سے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔

"تم چیخیں چلائیں نہیں؟"

"نہیں بابا ہم کبھی بوم مارا! ہم تو اسمائیل کیا' تم کو کیا معلوم۔"

اف! کم بخت ماری کو مسکرانے کی کیا ضرورت تھی؟

"سالا ایک دم پیچھے لا تھا۔" وہ تتلائی' تب سے معلوم پڑا منہ میں ایک دانت نہیں۔

"پھر؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہم بولا کیسا آدمی ہے' ہمارا ہاتھ پیر توڑے گا؟ اتنا رف کائے کو ہوتا۔ او کچھ سنتا ہی نہیں۔ بندر کا مافک بات کرتا۔ بابا ہمارا تو مستک فرگیا۔ ہمارا نوا اپرن فٹ گیا۔ ہمارا ڈیڑھ سو پاؤنڈ کا بتیسی گر پڑا' ایسا دھکا مارا۔ فٹ دو ٹکڑے۔ ہم اٹلی میں پورا ڈیڑھ سو کا بنوایا تھا۔ آئی یاں انڈیا میں کاں ملے گا' بولو؟" غصے سے وہ لال پیلی ہونے لگی' ہمارا ففٹی پونڈ کا وگ ایک دم' کچرا کر دیا۔"

"پھر؟" میں نے سوچا نیک بخت بتیسی اور وگ کا ماتم کیے جا رہی ہے' آگے نہیں بڑھتی۔

"بھاگ گیا سالا باسٹرڈ... اپنی ماں کا خصم!" وہ نہایت اچھوتی گالیاں تراشنے لگی۔

"بھاگ گئے... مگر میں نے تو سنا... وہ مسز کپور کہہ رہی تھیں کہ تم نے پولیس کو بیان دیا کہ تم کو غنڈوں نے بے عزت کیا۔"

"ہمارا کتنا انسلٹ کیا!" وہ مشتعل ہو کر اٹھ بیٹھی۔ میں نے کبھی اس کو روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی بے پلکوں والی مرگھلی آنکھیں لگاتار آنسو بہا رہی تھیں۔

"مالوم ہم کو کیا بولا؟"

"کیا بولا؟"

"سوری ممی!"

"اوہ۔"

"تبھی ہم فینٹ ہو گیا۔"

مگر میں فینٹ نہ ہو سکی' نمک کا کھمبا بنی بیٹھی رہی۔

❁❁❁

بھوبیٹیاں

جب صبح ہی صبح جھکی ہوئی نظروں سے ماتھے پر ذرا سا آنچل کھینچ کر حلیمہ نے بیگم کو سلام کیا تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ خیر سے صاحبزادے کی طرف سے جو جان کو دھکڑا لگا ہوا تھا وہ تو دور ہوا۔ فوراً دریائے سخاوت میں ابال آ گیا: چھ جوڑے' جو اسی مبارک موقعے کے لئے تیار رکھے تھے' عنایت ہوئے۔ ہاتھوں میں نوگریاں' گلے میں تسبی اور طلائی ایرن' جو صنوبر کی موت کے بعد چھوٹے میاں کی باندی کے لئے سینت لیے گئے تھے۔ اپنے ہاتھ سے بیگم نے دے دیے۔ تیل' پھلیل' سرمہ' مسی---- اور اب تو نگوڑے پاؤڈر کا بھی فیشن چل گیا ہے---- سب ہی کچھ مہیا کیا گیا۔ صاحبزادے کو لونڈی میں بیگم کا مزہ ملنا چاہئے! باجرے کی روٹی بھی اگر بچے گھی سے کھائی جائے تو پراٹھوں کا لطف دیتی ہے۔

منہارن بی نے سرخ سبز چوڑیاں پہنائیں۔ غریب حلیمہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہی۔ منہارن بی کی گندی گندی دعاؤں پر پانی پانی گھوئی جا رہی تھی۔ مردان خانے سے ملحقہ چھوٹا سا گھر چھمن میاں اور ان کی باندی کے لئے جھاڑ پونچھ کر سنوارا گیا۔ باندی بھی عارضی بیوی ہوتی تھی۔ صاحبزادے کی خدمت گزاری سے جو وقت ملتا وہ سلائی کڑھائی اور گھر کی سجاوٹ میں صرف ہوتا۔ بھاری کام نہیں لئے جاتے۔ زیادہ سے زیادہ گلوریاں بنا دینا' پان دھونا' سپاری کتر دینا' اپنے کپڑوں کے علاوہ میاں کے کپڑے دھوبی کو دینا لینا' کاج' بٹن کا خیال رکھنا' غسل کروانا' اور ایسے ہی ہلکے پھلکے کام۔ جبھی تو باقی چھوکریاں نواب زادوں کی باندیوں کو بڑے رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتیں۔ باسی سڑے کھانوں کے بجائے صاحبزادے کے

ہاتھوں تر نوالے ملتے تھے' صاف ستھرا بستر' اپنے کام کے بعد مزے سے پیر پھیلا کر سوؤ۔ اور پھر چھمن پر تو سب لونڈیاں مرتی تھیں۔ بالکل اللہ میاں کی گائے تھے۔ کبھی کسی کو ننگی ننگی نظروں سے گھورا تک نہیں۔ سب ہی کو ارمان تھا کہ اللہ ان کے نصیب میں بھی چھمن سرکار جیسا نواب زادہ لکھا ہو۔ گوئیوں نے پکڑ کر اسے سچ مچ دلہن بنا ڈالا۔ مہندی لگائی' خوب مل مل کر نہلایا۔ نگوڑی رو پڑی۔ گندہ دھن چھوکریوں نے اس کی دھجیاں بکھیر دیں۔

چھمن میاں کی خوشی تو نجم بٹیا کے ہار پھول سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوئی۔ زور دار رت جگا ہوا۔ نایاب بوبو مسجد میں طاق بھرنے گئیں۔ مقطع داڑھی دار مولوی نے میلاد مبارک پڑھا۔ رات کو شاندار دعوت ہوئی۔ گھر میں مراثنیں اور باہر قوال آئے۔ بڑے سرکار تو مجرے کی بھی ضد کر رہے تھے مگر ان کی منہ چڑھی رنڈی کسی شادی میں گئی ہوئی تھی۔

تو پھر شادی کے سر کیا سینگ ہوتے ہیں! سچ پوچھئے تو کیا نہیں ہوا۔ جہیز بھی ملا' منہ دکھائی بھی ہوئی۔ بس نکاح کے دو بول نہیں پڑھے گئے۔ ویسے تو چھمن میاں ہر سانس میں نکاح کے وعدے کرتے ہیں مگر نایاب بوبو کا کہنا ہے:

"ان نواب بچوں کے وعدے پانی کا بلبلہ ہوتے ہیں۔ ویسے بنو جو تمہیں کھانے کا شوق ہو تو کر لو نکاح ایک چھوڑ دس کرو پر رہو گی باندی کی باندی۔ بیگم بننا تھا تو کسی نواب زادی کی کوکھ سے جنم لیا ہوتا۔"

شیر مال' شامی کباب اور بریانی کھا کر بیویاں کلوں میں گلوریاں دبا کر گاؤ تکیوں کے سہارے ہو بیٹھیں تو اللہ رکھے چھمن میاں اور حرمہ بٹیا کی شادی کا ذکر نکل آیا۔ حلیمہ' جو پاس ہی بیٹھی گلوریاں لگا رہی تھی' کتھے کی پچی چونے میں اور چونے کی کتھے میں ڈالتی رہی۔

مریم باجی کی سالگرہ بھی اچانک ہو گئی۔ ویسے تو وہ جون میں پیدا ہوئی تھیں لیکن نومبر کوئی بہت فاصلے پر نہ تھا۔ دراصل یہ دعوت انیس میاں کے کہنے پر ہوئی تھی۔ وہ مریم کے لئے ایک بہت لائق لڑکا ڈھونڈ کر لائے تھے' آج اسے ایک

شاندار دعوت کے بہانے سے مریم سے ملایا جا رہا تھا۔

مریم سفید جھاگ سی ساڑھی میں واقعی کوئی مقدس روح لگ رہی تھیں۔ آج ان کی رنگت موم جیسی بے جان ہو رہی تھی' آنکھوں میں انجانی اداسیاں تھیں۔ فرید احمد اسے مسحور ہو کر تک رہے تھے۔ نہ جانے انیس نے مریم کے کانوں میں کیا کہہ دیا کہ آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ وہ شادی کے لئے تیار نہیں تھیں۔

"مجھے شادی نہیں کرنا۔" مریم نے پہلے یہ کہہ دیا تھا۔

"اے لڑکی دیوانی ہوئی ہے۔ تمہارے پاپا بہت اچھی سروس دلوا دیں گے۔ لڑکا غریب گھرانے کا ہے مگر سید ہے۔"

"وہ سید ہو یا شیخ' مجھے کسی سے شادی نہیں کرنا۔" وہ روتی ہوئی کمرے میں بھاگ گئی تھیں۔ حرمہ کی نگاہیں دروازے پر لگی تھیں۔ سب آ چکے تھے' صرف منصور غائب تھے۔ اور جب وہ میلی قمیض پہنے' بالوں میں انگلیوں سے کنگھا پھیرتے بھری محفل میں آن دھمکے تو جی ہی جی میں اس کی ہیکی ہو گئی۔

"اے لڑکے کہاں غائب تھا؟ ایسی کون سی نوکری ہے کہ دن ہے تو کام' رات ہے تو کام۔ آج اتوار کو بھی کام تھا؟"

"اے ممانی بیگم نوکری نہ نوکری کی دم---- بیگار ہے بیگار۔ تنخواہ نہیں ملتی۔" افضل میاں نے تشریح کی۔

"اوئی' خدا کی مار اس نوکری پر۔ شاید ابھی مستقل نہیں ہوئے!"

"اکابی تنخواہ کا تو ذکر ہی نہیں۔ مستقل ہو کر بھی نہیں ملتی۔"

"اے لوگو یہ کیسا اندھیر ہے! لڑکا دن رات کام میں جتا رہے ہے اور کوڑی نہیں ملتی۔ اے بھیا کیا اللہ واسطے کا کام ہے؟"

"اللہ واسطے کا کیوں شیطان واسطے کا کہو۔ یہ جو آئے دن شہر میں لاٹھی گولی چلتی ہے یہ ان ہی کی عنایت کا نتیجہ ہے۔" حیدر چچا نے قہقہہ لگایا۔

"اے تو یوں کہو پولیس میں ہے۔ پر بھیا پولیس میں تو بڑی آمدنی ہے۔"

ایک چندھی سی نانی اماں بولیں۔

"اے اکابی تم تھیریں سدا کی کوڑھ مغز۔ تمہارے پلے نہیں پڑے گی یہ بات۔ کاہے کو سر کھپا رہی ہو؟ مزے سے چھالیا کاٹو چھالیا۔"

"اکابی یوں سمجھو کہ پولیس کی لاٹھیوں کے لئے کھوپڑیوں کی ضرورت ہوتی ہے' بس یہ لوگ کھوپڑیاں تھوک میں سپلائی کرتے ہیں۔" حیدر چچا بولے۔

"اے ہے لڑکے یہ کیا سڑنا ہے۔ ڈھنگ کی کوئی نوکری کیوں نہیں ڈھونڈتا؟" اکابی بولے چلی گئیں۔

"آپ نوکر رکھ لیجئے اکابی۔" منصور نے ان کے پاس گھس کر کہا۔

"اے چل دیوانے۔"

"سچ اکابی۔ آپ کا پاندان مانجھا کروں گا' وضو کا لوٹا بھرا کروں گا' اور---- اور پن کٹی میں پان کوٹ کر کھلایا کروں گا۔"

"منصور میاں ہر بات مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔ آخر نوکری سے کیوں انکار ہے؟"

"انکار تو نہیں۔" منصور خود کو نواؤں کے نرغے میں دیکھ کر سٹپٹا گیا۔

"مل جائے تو کرو گے؟" حیدر چچا بولے۔

"آ... آ... جی ہاں۔"

"بھئی نوکری حماقت ہے' پیسہ بنانا ہو تو بزنس کرو۔"

"خاص طور پر آپ کی "بزنس"۔" رشید نے دبی زبان سے کہا۔

"یار رہنے دو' جھاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ جائیں گے۔" منصور نے کہنی ماری' پھر حیدر چچا سے کہا:

"جی آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔"

"اور تم چاہو تو انگلینڈ کی نیشنیلٹی دلوا سکتے ہیں تمہیں۔"

"چچا آپ کیوں انگلینڈ جا کر نہیں رہتے؟" رشید نے پوچھا۔

"یہ تمہاری چچی اماں ہائے توبہ مچانے لگتی ہیں۔"

"اے ہے کون اتنی دور جا کے مٹی پلید کروائے۔ مرو تو فرنگیوں کے ہاتھوں عاقبت خراب ہو۔" چچی نے تشریح کی۔

"بیگم اس کی تم چنتا نہ کرو' ہم انشاء اللہ پلین چارٹر کرا کے تمہاری میت لے آئیں گے۔"

"خدا نہ کرے۔ مریں اس کے دشمن--- توبہ!" اکابی بگڑنے لگیں۔

"اماں بزنس--- ڈیم بورنگ--- بنیا پن۔" منجھلے ماموں اپنی نئی نویلی انگریز بیگم کے ساتھ آتے ہی میدان میں کود پڑے۔ پچھلے سیزن میں شملہ گئے تو ہتھے چڑھ گئیں' یا یہ کہیے یہ ان کے ہتھے چڑھ گئے۔ وہ ان کے عزیز ترین دوست مسٹ رب کی بیوی تھیں۔ گرمیوں میں انہیں تو ٹور کرنا تھے' بیگم کو شملے بھیج دیا۔ وہ منجھلے ماموں یعنی لفٹنٹ مختار کے ہاں ٹھہریں۔ دل ہی تو تھا' منجھلی ممانی کو طلاق

کسی کا۔" رشید کی گودڑ الماری میں سے اس نے ایک قمیض نکال کر دی۔

"جلدی سے بدل کر آجایئے۔"

"جو حکم محترمہ کا۔" منصور بڑے اچھے موڈ میں تھا۔

اوپر اپنے کمرے میں مریم سسکیوں سے رو رہی تھیں۔ انیس ان کی انگلیاں چوم کر سمجھا رہے تھے: "ڈارلنگ بے بی' دنیا داری تو نباہنا ہی پڑے گی۔ ویسے کوئی فرق نہیں پڑے گا' تم میری ہو اور میری رہو گی۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے انیس۔"

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے ہنی؟"

"اسے پتا چل گیا تو؟" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"بڑا گاؤدی سا ہے' اسے کیا پتا چلے گا؟" دیکھا نہیں تم نے کس بری طرح گھور رہا تھا تمہیں؟"

"گدھا کہیں کا!" مریم غصے سے کانپ اٹھی۔

"ارے نہیں' غریب گھر کا لڑکا ہے بے چارا' اس نے تم جیسی قتالۂ عالم

لڑکیاں کہاں دیکھی ہوں گی' تمہارے پیر دھو دھو کر پیئے گا۔"

"میں زہر کھالوں گی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو گا۔"

"میری جان کیوں رائی کا پہاڑ بنائے دیتی ہو۔"

"میں رنڈی نہیں ہوں: آج اس کی کل دوسرے کی۔"

"مائی سویٹ بے بی' حالات تم جانتی ہو' ورنہ ذرا سوچو میرے دل پہ کیا گزر رہی ہے! مصلحت اسی میں ہے۔"

"تو آپ طلاق کیوں نہیں لے لیتے! کیا فائدہ ڈھونگ رچانے سے؟" مریم جل گئی۔

"کاش طلاق لے سکتا۔ ہماری سول میرج ہوئی تھی' دوسرے میرے اوپر اتنا قرض ہو گیا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ یہ قرضہ کسی طرح چک جائے' پھر میں کوئی نوکری تلاش کروں گا' پھر تم کھلے بندوں میری ہو جاؤ گی۔ دوسری صورت کے لئے بھی تم تیار نہیں ہوئیں۔ ڈاکٹر میرا دوست ہے--- مگر اب تو بہت دیر ہو گئی ہے میری جان۔"

"آپ مجھ سے بور ہو چکے ہیں' پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔" مریم رونے لگیں۔

"یہ تمہارا وہم ہے بے بی۔"

"تو پھر وہ لڑکی--- جس کے ساتھ آپ گھومتے پھرتے ہیں۔"

"اوہ! تم تو حد کرتی ہو بھئی۔ بزنس کے سلسلے میں---"

"میں خوب جانتی ہوں آپ کی بزنس۔"

"دیکھو ڈارلنگ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم تو ہماری بیگم سے بھی چار ہاتھ آگے نکل گئیں۔ اس نے تو میرے اوپر کبھی پہرے نہیں بٹھائے۔"

"وہ خود جو ہرجائی ہیں' آپ کو کس منہ سے منع کر سکتی ہیں۔"

"میں بھی تو تمہیں منع نہیں کرتا۔ جانی مجھ سے زیادہ براڈ مائنڈڈ انسان تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔"

"ہاں' آپ میرے لئے دولہا ڈھونڈ کر لائے ہیں۔"

"مگر بے بی ہنی کوئی فرق نہیں پاؤ گی تم۔ آئی ایم ریلی میڈ اباؤٹ یو۔ اچھا اب من بھی جاؤ۔" انیس نے اسے اتنا گدگدایا کہ وہ ہنس پڑی۔

آج الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ مئے ارغوانی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ بجائے حرمہ کے آج منصور کی نظریں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ان نگاہوں میں اسے اپنی فتح کا عکس نظر آ رہا تھا۔ آج اس نے نہایت چست قمیض اور تنگ موری کی شلوار پہنی تھی۔ فاختہ کے پروں جیسا شفان کا دوپٹہ نام چار کو کندھوں پر پڑا تھا۔ ساڑھے تین انچ کی سینڈل پہن کر وہ منصور کے کان کی لو تک پہنچ رہی تھی۔ اس نے کئی بار انجان بن کر منصور سے اپنے کو ناپا۔ کس قدر موزوں جوڑی تھی!

حیدر چچا منصور کے پاس بیٹھے بڑے زور شور سے کوئی بالکل بے تکی بحث کر رہے تھے۔ جب ان پر چڑھنے لگتی تھی وہ ہر بات کی کاٹ کرنے لگتے تھے' حتیٰ کہ خود اپنی کاٹ شروع کر دیتے تھے۔ کبھی ایک دم کیونسٹوں کے خلاف محاذ بنا لیتے اور منصور یا رشید کو گھیر کر الجھنے لگتے' کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا بھر کے کیونسٹوں کی بے عنوانیوں کے یہی جواب دہ ہیں۔ اس وقت ان کے لہجے میں ہائیڈروجن بم گرجنے لگتے۔ کبھی ایک دم پلٹا کھا جاتے اور خود کیونسٹوں سے بھی زبردست کیونسٹ بن جاتے کیونکہ کسی زمانے میں وہ بال بال سرخ ہوتے ہوتے بچے تھے۔

"ارے میاں تم لوگوں سے بہتر کیونزم تو ہمارے دفتر میں موجود ہے۔ پچھلے مہینے ہمارے چپراسی کی لڑکی کی شادی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا کہ سرکار صرف دو منٹ کے لیے آ جائیے' میری لاج رہ جائے گی'۔ بس جناب ہماری بیگم کا دل موم کا تو ہے ہی' پگھل گیا۔ فوراً ساڑھی لے کر پہنچیں۔ حالانکہ تحفے صرف برابر والوں کو دیے جاتے ہیں مگر میں نے کہا: کیا چپراسی انسان نہیں؟ اور پھر مسلمان بھی ہے۔ کیا نیچ لوگوں کے دل نہیں ہوتے؟ بیگم ضرور تحفہ دو' خیر صاحب گئیں بیگم اور دیا تحفہ۔"

منصور اور رشید سمجھ گئے کہ ضرور یہ وہی ساڑھی ہو گی جس کے بارے میں

مریم اور حرمہ کہہ رہی تھیں پرانے گوٹے والے نے دس روپے لگائے تھے۔ چچی بیگم یوں ٹھاٹ سے نئے ڈبے میں سجا کر لے گئیں کہ براتی دنگ رہ گئے۔

منصور چچا سے باتیں کرنے میں منہمک تھا مگر اس کا ہاتھ ان کے پیچھے سے گزر کر ان کے دوسرے بازو پر بیٹھی ہوئی حرمہ کے ریشمی بالوں میں بھٹک رہا تھا۔

"چاند خاں چپراسی خوشی کے مارے پاگل ہو گیا۔ میرے پیر پکڑ لیے غریب نے۔ بتائیے صاحبزادے اسلام میں اور کیونزم میں کیا فرق ہے! اللہ پاک فرماتا ہے اپنے غلاموں کے ساتھ سلوک کرو۔" چچا ہانک رہے تھے۔

"جی بجا فرماتے ہیں آپ۔" منصور بے سوچے سمجھے جواب دے رہا تھا۔ اس کی روح اس وقت اس ہاتھ میں کھنچ آئی تھی جو حرمہ کے بالوں سے پھسل کر گردن پر لرز رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا: "قبلہ میں قطعی آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار ہوں مگر خدارا ایسے گردن نہ موڑیے کہ حرمہ ڈر کر دور ہو جائے۔"

"اللہ پاک فرماتا ہے جو دنیا میں میرے نام پر ایک درم دے گا اسے عقبیٰ میں ستر ہزار درم ملیں گے۔"

"سودا برا نہیں۔" منصور نے بڑی فرمانبرداری سے کہا۔ حرمہ نے اس کی انگلی میں باریک سی چٹکی لی اور وہ اچھل پڑا۔ چچا چوکنے ہو گئے' حرمہ جھپ سے اٹھ کر بھاگی۔ انہوں نے گردن موڑی تو منصور بھی غائب تھا۔ بے چارے حیران رہ گئے۔ انہیں شبہ بھی نہ تھا کہ یہ دونوں انہیں ٹٹ بنائے پیٹھ پیچھے چوہے پکڑ رہے تھے۔

کسی نے دونوں کو پائیں باغ کی طرف جاتے نہ دیکھا' سوائے فرخندہ بانو کے۔ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں اور دل نے ٹھیس محسوس کی۔ یا ایک جھلک بہمن میاں نے دیکھی جو دیر سے آنے کی معذرت کر رہے تھے۔ منگنی ہو جانے کے بعد سے وہ اور حرمہ کچھ جھینپ محسوس کرنے لگے تھے۔ اگر بہمن کبھی چوری چوری اس کی طرف دیکھتے بھی تو یوں جیسے چوہا بلی کو دیکھتا ہے۔ حرمہ ان سے چڑی ہوئی بھی تھی مگر

آج تو وہ بڑے بانکے ترچھے لگ رہے تھے۔ جسم پر بوٹی بھی آگئی تھی' بال بھی برل کریم لگا کر سنوارے گئے تھے۔ ضرور حلیمہ نے بنا سنوار کر سسرال بھیجا ہو گا!

سارے خاندان کو معلوم تھا کہ حلیمہ بجمن پر دو آتشہ بن کر چھا گئی ہے' بجمن کی دلہن کو بڑے تیر و تفنگ استعمال کرنے پڑیں گے۔ انہیں تو دنیا میں سوائے حلیمہ کے دوسرا نظر ہی نہیں آتا۔ کیا وحشت ہے! کیا سرور ہے! پانی کا سا لطف کہ روز پینے کے بعد بھی ہمیشہ کیلئے پیاس نہیں بجھتی۔

بجمن نے آج بے باکی سے حرمہ کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی نظروں میں منگیتر کی حیثیت سے کوئی پیغام نہ تھا' برادرانہ دلچسپی کا اظہار ضرور تھا۔ حرمہ نے مسکرا کر انہیں ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور باغ کی طرف بھاگ گئی۔

اس کا چہرہ تمتا رہا تھا' وہ سیدھی غسل خانے میں جا کر منہ پر سرد پانی کے چھپکے مارنے لگی۔ جب دل کی دھڑکن ذرا قابو میں آئی بال ٹھیک کرنے کے لیے وہ مریم کے کمرے میں چلی گئی۔ بجلی جلائی تو دھک سے رہ گئی۔

مریم کی نازک پلنگڑی پر سفید جھاگ جیسی آب رواں کی ساڑھی موجیں مار رہی تھی جس کے اتار چڑھاؤ میں دو پتلون زدہ ٹانگیں غوطہ زن تھیں۔ وہ گرتی پڑتی الٹے پیروں بھاگی۔ دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتی وہ تیزی سے زینے پر سے اترنے لگی۔ آخری سیڑھی پر اس کا پیر دوپٹے میں الجھا اور وہ اوندھے منہ منصور کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں گری۔

حرمہ کو بدحواس دیکھ کر منصور بھی پریشان ہو گیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے اسے سنبھال کر پوچھا۔ حرمہ ایک دم سسک کر رو پڑی اور اپنا منہ اس کے سینے میں چھپا لیا۔ اس قربت نے آگ پر تیل کا کام کر دیا: مولسری کے تناور درخت کے نیچے دونوں پگھل کر بہہ گئے۔

"اف! یہ لڑکیوں کی قمیض کہاں سے کھلتی ہے؟ ہزاروں بٹن' لاکھوں ہک!"

ڈرائنگ روم میں نوجوان لڑکے لڑکیاں میوزیکل چیئر کھیل رہے تھے۔ ان کے قہقہے اور تالیوں کی آواز دور کسی دنیا سے آ رہی تھی۔ کائنات سنسان تھی'

سوائے دو دلوں کی دھڑکن کے۔

منصور نے دھندلکے میں حرمہ کے نیم وا پیاسے ہونٹ اور چاہت میں سلگتی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ اس کے کاغذ جیسے سفید گالوں پر موتی اب تک چمک رہے تھے۔ اجلی چاندنی جیسا کنوارا سینہ کنول کے پھولوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ ٹھنڈی زمین پر دھکتی ہوئی حرمہ اور چار بڑے پیگ کا نشہ!

آنکھیں! معصوم' بھوکی آنکھیں! انجانی خواہشات سے چھلکتی آنکھیں! حرمہ کی آنکھیں! منصور کی آنکھیں! اس کی محبوبہ کی آنکھیں! پیارے دوست کی آنکھیں!

جیسے زور سے کسی نے اسے دھکیل دیا۔ وہ بچوں کی طرح سہم گیا اور کہنیوں میں منہ چھپا لیا۔ وہ شیر جو دو پل پہلے زور شور سے گرج رہا تھا دبک کر غار میں واپس لوٹ گیا۔ ڈرتے ڈرتے حرمہ نے اس کا ہاتھ چھوا۔ اس کے گالوں پر لمبے لمبے آنسو بہہ رہے تھے' سینے میں سسکیاں ابل رہی تھیں۔

دیر تک دونوں خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جب سانسیں ٹھہر گئیں' گئے حواس واپس آئے تو منصور نے اس کے دونوں سرد ہاتھ اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر رکھ لیے۔ اس حرکت میں وحشیانہ خواہش تھی' نرم و نازک پیار تھا۔

جب دونوں شور و غوغا کی طرف واپس لوٹے تو ایسا معلوم ہوا ساتھ کوئی خواب دیکھ کر آئے ہیں۔ عمداً "ایک دوسرے سے دور دور' دو نازک بلبلوں کی طرح الگ الگ کہ کہیں ٹکرا کر پھوٹ نہ جائیں۔ مریم سے آنکھ ملانے کی حرمہ کو ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ انیس سے اسے گھن آ رہی تھی۔ مگر اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مریم فرید سے بڑی شرارت بھرے انداز میں میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ انیس دونوں کی باگیں تھامے ہانک رہے تھے۔

بجمن معافی مانگ کر جا چکے تھے اور ان کی پیاری امی اور نایاب بوبو بڑبڑا رہی تھیں:

"اے میں قربان! کیوں فکر کرتی ہیں؟ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری

رات! الٹیاں لگی کہ موئی صاحبزادے کے جی سے اتری۔" اور حرمہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس گدھے نے حلیمہ کو چھوڑ دیا تو وہ اس کے منہ پر تھوک دے گی۔

❀❀❀

کلو کی ماں

سہاگ کی رات جب وہ مجلہ عروسی میں داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہے کہ.......

جمو بجیاء کے چالے کا جوڑا دھوم دھڑا کے سے سل رہا تھا۔ چچی بی اور اماں جی میں دھواں دھار بحث ہو رہی تھی۔ چچی بی مصر تھیں کہ چھپا طوئی کا زمانہ گیا۔ نئے فیشن کی رو سے بنت کے اوپر تلے اسنبولی بیل اور گنگا جمنی کرن خوب کھلے گی اماں جی کہتی تھیں۔

"کرن موئی تنفنی دو گھڑی میں بٹ کر ستلی ہو جاوے ہے چھپا برسوں جمی ہو ہے۔

بجیا اپنے جہیز سے دور بے تعلق سی بیٹھی بچوں کے سنگ کوٹ پیس کھیل رہی تھیں مگر جی ان کا بنت اور گو کھرد میں الجھا ہوا تھا۔ وہ ان دیدے کا پانی ڈھلی کنواریوں میں سے نہ تھیں جو کھلے بندوں بیٹھ کر اپنا جہیز سیتی ہیں۔ کبھی ان سے کچھ ٹنکوانا ہوتا تو چچی بی کہتیں۔

"جمو بیٹی ذرا میرے کرتے پر مخمل کے پھول ٹانک دو۔" بجیا سمجھ جاتیں مگر پھول ٹانک دیتیں سب کے سامنے نہیں' دالان در دالان لے جا کر چچی بی نے پستی کریپ کے ڈوپٹے پر ٹاپی کی بنت کے آس پاس اسنبولی بیل اور گنگا جمنی کرن جما کر پوچھا۔

"کیوں جمو' کیسا لگتا ہے؟"

بجیا شرم سے کنارہ ہو گئیں اور بوکھلاہٹ میں اپنے اڑی کے اکے پر ترپ مار دیا۔ اماں جی نے کہا۔ "ہے ہے دولہن' خدا خیر کرے' تمہاری تو جانو مت ماری گئی

ہے۔ اے وہ بچاری کیا بولے گی۔"

مگر کہنا چچی بی کا ماننا پڑا' چچی بی تھیں بھی تو فیشن ایبل' پوپٹوں کے بال کا فیشن وہ اپنے میکے سے لائیں جو سارے محلے میں وباء کی طرح پھیل گیا۔ کاشغاری سیندھ تک پوتتی تھیں۔ سرخ پتنگ کا کاغذ جس میں زیور بندھ کر آتے' ہمیشہ ان کی پاندان کی ڈبیا میں اڑسا رہتا۔ سب کی آنکھ بچا کے پان کھاتے وقت ہونٹوں پر کاغذ تھوک سے تر کر کے گھسا مار لیتیں' اور ان کے قتّابوں لپ اسٹک لگ جاتی۔ کرن کے حق میں فیصلہ ہونے کے بعد جوڑا سلنے لگا۔ چندھی میاں نے ترنگ میں آ کر لرزتی بلغم بھری آواز میں گانے شروع کر دیے۔ ایک دم جیسے سب کے دلوں میں شہنائیاں بج اٹھیں۔ شادیوں کا موسم سا ٹوٹ پڑا۔ جوڑے پہ جوڑے لگائے جانے لگے۔ رفیق میاں کی رضیہ بی سے فریدہ بی کی پنو میاں سے' رشید میاں کی صفو بی سے ڈوڑ باندھی جانے لگی۔

"تو کس سے بیاہ کرے گا رے؟"" مذاق میں چچی بی نے ججو سے پوچھا۔

"تم سے! دو برس کے ججو نے ماں کی گود میں مچل کر فیصلہ کیا' سب ہنس پڑے۔ بات پھیلتی ہی گئی' یہاں تک کہ کنواری بجیا کے ہونے والے لڑکے یا لڑکی کا بھی جوڑا لگا دیا گیا۔ کلو کی ماں دہلیز پر بیٹھی دھنیا کی گری کوٹ رہی تھیں۔ ترنگ میں آ کر بولیں۔ "اے رے کلوے تو کس سے بیاہ کرے گا؟"

"چھابہ بی بی سے' پانچ برس کے کلوے نے کپا گالوں والی نوشابی کی طرف پیار سے دیکھ کر کہا' اور چھابہ بی بی کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ سب ہی ہنس پڑے مگر چچی بی کا شہابی رنگ تمتا کر قرمزی ہو گیا۔ اٹھا جوتی' تڑ تڑا کلو کے ناک' منہ اور سر پر جڑ دیں۔ ہنسی میں تھنسی ہوئی تاش کے پتے پھینک پھانک جمو بجیا روتے ہوئے ججو کو کولہے پر ٹکا کے کھسکنے لگیں۔ اماں جی نے بسورتی ہوئی چھابہ کو گود میں سمیٹ لیا۔ کلو کی ناک سے جیتے جیتے خون کی تلی بہنے لگی۔ کلو کی ماں چھاتی پیٹ پیٹ کر دھاڑی۔

"ہائے میرے پوت کو مار ڈالا۔ ہائے میرا بن باپ کا بچہ۔"

"کلوے کا بچہ۔ خیرات کے ٹکڑوں پر پلنے والا اور اس کے یہ لچھن۔ موری کا کیڑا اور دماغ آسمان پر" چچی بی کا پٹھانی خون کھول کر لاوا بن گیا۔ "حرام زادے کو روٹیاں لگی ہیں۔"

"ہے ہے' دلہن' سید بچہ ہے۔" اماں جی نے سر پیٹ لیا۔ "اس کی بساط ہی کیا۔ تم کاہے کو اپنی عاقبت سنوارو۔"

"چولہے میں پڑے سید بچہ اور بھاڑ میں جائے سیدانی۔ میری بچی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو دیدے نکال لوں گی۔" اماں جی روکتی رہیں پر چچی بی بپھر چکی تھیں۔ کلو کی ماں نے اوپر سے دو دھموکے کلو کی پیٹھ پر اور جمائے اور اس کی سات پشتوں کو کوسنے لگیں۔

"اے تجھے ڈھائی گھڑی کی آوے۔ باوا کو کھا گیا۔ اب جنم جلی کے سر چھپانے کی جگہ تھی۔ سو وہ بھی ملیا میٹ کر کے دم لے گا۔ خدائی خوار' نامراد۔" وہ اسے گھسیٹی ہوئی باورچی خانے میں لے گئیں۔

کلو کی ماں ویسے ہماری دوُر کی خالہ تھیں۔ پڑوسنوں کو خالہ کہہ لینے پر انہیں خالہ کہتے عار بھی آتی۔ امتیازی تو نہ کہتے پر کلو کی ماں ضرور کہتے۔ گرتے گرتے ان کی پوزیشن نوکروں جیسی ہو گئی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتیں' دو چار دن کی مہمان داری کے بعد لوگ دھیرے دھیرے انہیں ڈھب پر لے آتے۔ ماما کھسکا دی جاتی اور وہ بغیر تنخواہ کے صرف پھٹے پرانے کپڑے اور روٹی پہ ماما کا عہدہ سنبھال لیتیں۔ میاں لام پر گئے۔ سو نہ جانے کس کی گولی کھا کر ڈھیر ہو گئے۔ امتیازی خالہ کا تو کسی لال منہ والے سے بیر بھی نہ تھا۔ پر اللہ جانے کس اللہ کے بندے نے ان کی مانگ اجاڑ دی۔

تنخواہ کا کوئی ذکر نہیں' بھلا اپنے رشتہ داروں کو تنخواہ دے کر کون ذلیل کر سکتا ہے؟ ہاں عید بقر عید پر "آپا سلام" اور دولہا بھائی" سلام کے صلہ میں اٹھنی اماں جی سے اور روپیہ ابا جی سے ضرور مل جاتا تھا اور دوسرے نوکروں کی طرح "بیگم صاحبہ" نہیں کہنا پڑتا تھا بلکہ آپا اور دولہا بھائی کہنے کا فخر حاصل تھا۔

کلو کی ماں جو یوں تیرے میرے در پر ماتھا رگڑتی تھیں اس کی بھی ایک وجہ تھی وہ چاہتی تھیں کہ ان کا کلو لکھ پڑھ کر کسی قابل ہو جائے اور وہ راج جو وہ میاں کے دم سے نہ کر سکیں، کلو کے دم سے نصیب ہو۔ اتنے بچے پڑھتے ہیں، ایک کلو بھی پڑھ جائے گا۔ مگر کلو کے سپرد ہزاروں ڈیوٹیاں تھیں، چچی کی کمر دبانی، دوپہر کو پیر کے انگوٹھے میں رسی کھینچنا۔ تجھے مجھے پانی پلانا، ایک دم سارے گھر ہی کو پیاس لگ جاتی۔ کلو کو ایک مشک پانی کٹورہ کٹورہ کرکے ڈھونا پڑتا۔ ججبو اور چھابہ کے ساتھ کھیلنا۔ ہزار بار جھنجھنا گرائے تو اٹھانا، چھابہ بی کی گڑیا کو ایک منٹ میں چھتیس بار ڈوپٹہ اوڑھاتا، مہترانی سے پوتڑے دھلوانے کے لئے پانی ڈالنا، وقت ہی کہاں ملتا تھا جو کلو علم و ادب کی طرف رجوع کرتا، ویسے مولوی صاحب مفت کا الو پڑھانے کے قائل بھی نہ تھے کلو کے کپڑے بھی تو اس قابل نہ رہتے تھے کہ وہ سب بچوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ سکے۔

ہمارے ہاں باورچی تھا، اس لئے ماما گیری سے تو کلو کی ماں کو نجات ملی ہوئی تھی۔ مگر گیہوں پھٹکنا۔ دالیں بیلنا۔ مسالے کوٹنا۔ بچوں کو نہلانا دھلانا۔ جنس تلوانا، کسی کے ہاں بچہ ہو تو راتوں کو زچہ کے سرہانے جاگنا کہ کہیں بلی حرام خور نال کی بسوہد سے لگی چلی آئے اور بچہ کو چبا کے نہ رکھ دے۔

کلو چند مہینے کا گود میں ہو گا کہ سناونی آگئی، نہ میت اٹھی نہ جنازہ آیا نہ تربت بنی بس ایک تار نے چوڑیاں ٹھنڈی کر دیں۔ کانچ کی چوڑیاں اور دو پیسے مہینے کے گلابی فیروزی رنگ سے پیچھا چھوٹ گیا۔ جوان بیوہ کس کو بھاوے، جہاں گئیں نکلنا پڑا، لڑھکتی پڑھکتی ہمارے ہاں آکر دم لیا تھا تو کلو کی عشق بازی نے پیر اکھاڑ دیے، دو چار پیغام بھی آئے خود شوقین مزاج چھوٹے چچا نے ہاتھ صفا کرنے کی کوشش کی مگر کلو کی ماں نے پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیا۔

"نہ میا، میرا پوت جوان ہو گا تو کیا کسی کو منہ دکھائے گا کہ میا نے خصم کر لیا۔" ویسے وہ چچا کی شادیوں کی لت سے بھی واقف تھیں۔ بیاہتا بیوی پر بتولن لا بٹھائی۔ بتولن پہ بساطن اس پہ دھوبن، میراثن اور بھنگن کا نزول ہوا غرض میاں

نے کوئی "بن" یا "تن" نہ چھوڑی اور جب ان کی بیویوں میں جو تم پیزار بڑھتی وہ ایک نئی ہلہلری لا کر چھوڑ دیتے۔ ان کے حصے دالان میں یتیم خانہ کھلا ہوا تھا، کلو کی ماں میں دم درود بھی نہیں تھا۔ پچیس برس کی عمر میں کھکھو ڈائن ہو کر رہ گئی تھیں۔ صورت پہ مکھیاں بھنکتی تھیں۔ ازلی رنڈاپہ برستا تھا۔ آئے دن نیم تلے کھٹیا پہ لحاف اوڑھے جوڑی بخار سے کشتی لڑا کرتیں ویسے کوئی کام کی چیز کوئی کاہے کو بیاہے۔ مفت کی نوکرانی کسے بری لگتی ہے۔

اسی شام انہوں نے بخار میں جھلتے ہوئے کلو کو کندھے سے لگایا اور پڑوس میں نواب ممتاز کے شاگرد پیشے میں جا پڑیں۔

نواب صاحب کا بھرا پرا گھر تھا۔ پڑھے لکھے فیشن ایبل لڑکے لڑکیاں، بہوئیں، کوٹھی کے شاندار احاطے میں آئے دن ڈنر پارٹیاں ہوتیں اور اسی کوٹھی کے ایک گمنام سے کونے میں نواب صاحب پڑے زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے، دو سال سے ان کی اب تب ہو رہی تھی مگر جانو اللہ میاں سے پٹہ لکھا کر لائے تھے، اچھے بھلے جوان لڑھک جائیں پر بڈھا کس سے مس نہ ہو۔ ایک تو دنیا بھر کی بیماریاں جن میں پرانی تبخیش اور گھٹیا پیش پیش، اوپر سے بڈھے کا دماغ ساتویں آسمان پر منہ پر وہ مغلظات کہ کوئی نوکر آٹھ دن سے زیادہ نہ ٹھہرتا، کلو کی ماں کے بھاگوں ان کا نوکر بھاگا، ہوا تھا لہٰذا سات روپے مہینہ اور کھانا اور سال میں دو جوڑے سوسی کے کپڑوں پر وہ نواب صاحب کی نرس کے طور پر رکھ لی گئیں ہمارے خاندان کی تو ناک کٹ گئی۔ نواب صاحب کے ہاں سے پہلے ہی لین دین بند تھا وہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتے تھے۔ اب تو اور بھی تن گئی۔

نہ جانے کلو کی ماں کی تیمارداری نے رنگ دکھایا یا بڈھا ضد باندھ رہا تھا، بجائے سانسوں کی ڈور ٹوٹنے کے اور مضبوط ہو گئی، بڈھا بدمزاجی کا ٹھیکیدار تھا۔ بچاری سر جھکا کر ان کی گالیاں کوسنے سنا کرتی۔ کوٹھی میں قہقہے گونجا کرتے اور وہ بیٹھی بڈھے کی قے سمیٹا کرتی۔

اور پھر بڑے میاں کی گالیوں میں کمی آنے لگی، گلاس، رکابی مار پھینکنے کی

عادت میں بھی کمی آگئی۔ کبھی کبھی ترنگ میں آکر سرہانے سے اکنی نکال کر کلو کو دیتے۔ "کیوں بے' کیا لے گا؟" وہ اس سے مذاق میں پوچھتے۔

"جی' روشنائی۔"

"روشنائی! ابے گھاس کھا گیا ہے؟ گجک لیجیو' اچھا۔"

"جی اچھا۔" کلو سہمی ہوئی آواز میں کہتا۔

"کلو کی اماں تم میری پوتیوں کے برابر ہو' پر نامحرم سے یہ گومٹ کراتے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں گناہ کر رہا ہوں' اب بڑھاپے میں مرتے وقت عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ اگر تم مناسب سمجھو تو نکاح کر لو۔"

کلو کی ماں سے سلا بچی چھوٹتے چھوٹتے بچی' کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی کوٹھڑی میں چلی گئیں اور دیر تک بے سدھ پڑی رہیں پھر ایک دم جی بھر آیا' اور خوب بھڑاس نکالی ہائے مرنے والے' یہ تم نے کس قصور کی سزا دی۔

شام کو جب وہ بیڈ پین لے کر آئیں تو بڑے میاں تکیئے کے سہارے بیٹھے تھے۔ "مجھے حاجت نہیں' ابھی کریم آیا تھا' اس نے فراغت کرادی۔" انہوں نے ذرا سوکھی آواز میں کہا' اور کلو کی ماں کا خون خشک ہو گیا۔ یا مولا! اب کتنی سیڑھیاں باقی رہ گئی ہیں۔ سر چکرایا اور دروازے سے ٹک گئیں۔

"سردے کی دو پھانکیں ذرا برف لگا کر لے آؤ۔" بڑے میاں اپنی روکھی کھردری آواز میں بولے۔ آنسو جھٹک کر کلو کی ماں سردے کی قاشیں لے آئیں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف بڑے میاں کی ڈھیلی بتیسی کی چڑ چڑ سنائی دے رہی تھی۔

بڑے میاں کچھ نادم' کچھ جھینپے سے سردے کے قتلے چکھتے رہے۔ کلو کی ماں کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

اتنے میں چق کے پیچھے سے کلو کی آنکھیں چمکیں ماں نے اشارے سے بھگانا چاہا۔ مگر بڑے میاں بولے۔

"آنے دو بچے کو۔" کلو دبا دبا آیا' اور گھبراہٹ چھپانے کو کبھی ایک پیر پر اور کبھی دوسرے پیر پر ڈگمگاتا رہا۔

"کچھ پڑھتا وڑھتا بھی ہے یا بس ڈنڈے بجاتا ہے۔" پاس بلا کر وہ کلو سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ کلو کی ماں جب ان کی بتیسی دھو کر لائیں تو وہ بڑے میاں کو چھ کا پہاڑا سنا رہا تھا۔ اور وہ آنکھیں بند کئے اونگھ رہے تھے۔ ماں کے اشارے پر کلو باہر جانے لگا تو بڑے میاں غرائے۔

"ہم سو نہیں رہے ہیں کلیم الدین۔"

کلیم الدین--- بڑے بڑے آنسو کلو کی ماں کی آنکھوں میں بھر آئے کلیجہ سن ہو گیا۔ بس کلو کا باپ یوں کلیم الدین لکھا کرتا تھا۔

"کلیم الدین کو پیار۔"

اس کے آخری خط میں بھی تھا۔ پر اب تو وہ دنیا میں کلو ہی بن کر رہ گیا تھا۔ اور وہ اس گمنام سے کلو کی ماں! منہ پھیر کر جب وہ خالی رکابی اٹھانے لگیں تو پھر گرجے۔

"ہم پہاڑا سن رہے ہیں۔ دیکھیں پاجی کو کچھ یاد بھی ہے یا نہیں ہاں بھئی تو چھ سے؟"

"بیالیس۔" کلو نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اور کلو کی ماں کا دل پگھل کر آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔

بڑے میاں نے پھر نکاح کی بات نہیں چھیڑی۔ مگر کلو سے ان کی دوستی یارانے کی حد کو پہنچ گئی۔ آہستہ آہستہ وہ ان کے بستر پر بیٹھنے لگا۔ دونوں دو پتیا کھیلتے تو بڑے میاں خوب بے ایمانی کرتے اور کلو ان سے جھگڑتا ان کے بستر پر بیٹھنے کے لئے کلو کو کپڑے بھی صاف پہنانے پڑتے ویسے اب اسے کام کاج نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اسلیے اتنا میلا بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک دن تاش کھیلتے کھیلتے ایک دم بولے۔ "چودہ پنجے۔"

"اکیاسی۔"

"ایں!" بڑے میاں غرائے۔ "کیا کہا؟ اکیاسی! کریم خان' اس الو کے پٹھے مولوی کی داڑھی پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو۔"

جب مولوی صاحب آئے تو بڑے میاں ہنکارے۔

"سنیے مولوی صاحب! ہاں بھئی کلیم الدین "چودہ پنجے؟"

"اکیاسی" کلو نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"سنا آپ نے مولوی صاحب؟ چودہ پنجے اکیاسی! بچے کو آپ اپنا سر پڑھاتے ہیں؟"

بڑے میاں نے مولوی صاحب کی گھنٹہ بھر ٹانگ کھینچی۔ پھر کلو کی ماں کی چار گھنٹے جان سولی پر کر دی اور اس دن سے مولوی صاحب برآمدے میں بیٹھ کر کلو کو سبق دینے لگے۔ سنک سوار ہو جاتی تو بڑے میاں، مولوی صاحب اور کلو دونوں کا دھوبی گھاٹ کر دیتے۔

صاف ستھرے پوتوں نواسوں کو کہاں اتنی فرصت تھی جو اپنی نرسری اور کنڈرگارٹن سے پرانے پیچش میں سڑتے ہوئے دادا میاں کے پاس آتے۔ کئی کئی دن گزر جاتے۔ کوئی پلٹ کر نہ پوچھتا۔ لوگ منتظر تھے، کب بڑے میاں مریں اور ان کا دھوم دھام سے چالیسواں ہو۔ پیار کا بھوکا کلو بڑے میاں کی سنسان بوڑھی زندگی میں تر و تازہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ دو پیار کے ترسے ہوئے ایک چھوڑ ہزار جان سے ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ گھنٹوں دونوں میں ایسے گھل مل کر باتیں ہوتیں، جیسے وہ ہم سن ہوں۔

"ابے کلیم، فاختہ نے دانہ کھایا؟"

"نہیں ابا جی، چاول ویسے کے ویسے پڑے ہیں"

"املی، گاودی ہو نرے۔ فاختہ چاول پر منہ نہیں ڈالے گی۔ اسے کودوں دو"

اور دونوں سر جوڑ کر فاختہ کو کودوں کھلاتے۔ وہ ایک دانہ کھا لیتی تو بڑے میاں کو چلوؤں خون بڑھ جاتا۔

اور ایک دن بڑے میاں اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب کلو کی ماں نے انہیں لاٹھی کے سہارے دوسرے ہاتھ سے کلو کا کندھا پکڑے صحن میں کیاریوں کے پاس دیکھا تو کلیجے میں گولی سی لگی۔

کوٹھی میں بم پھٹ پڑا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ رات کو دادا میاں نے کلو کی ماں سے نکاح پڑھوا لیا۔ بیس ہزار مہر نقد بنک میں اور نہر والی کوٹھی جس کا ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کرایہ آتا تھا۔

"میں نہ کہتی تھی، وہ ایک حرافہ ہے۔" چچی بی نے کہا۔ حالانکہ یہ پیش گوئی انہوں نے اسی دم گھڑی تھی۔

ہفتوں کلو کی ماں اور دادا میاں کے چرچے محلے والے نمک مرچ لگا کر کرتے رہے۔ ایک شاعر قسم کے نوجوان نے تو ان پر نظم تک کہہ ڈالی۔ خاندان والوں کی لے دے سے تنگ آ کر بڑے میاں نے اپنی طرف کے دروازے میں اینٹیں چنوا دیں۔ سب کی محبت پھڑپھڑا کے جاگ اٹھی۔ اور لاوارث بڈھا سب کا چہیتا بن گیا۔ مگر ضدی بڈھے کے منہ لگنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں کلو کی ماں کے جادو میں آ کر رہی سہی جائیداد نہ دے ڈالے۔ اور مفت کے عیش میں چنگاری پڑ جائے۔

نکاح کی رات جب رفع حاجت کے بعد بتیسی دھو کر گلاس میں ڈال کر سرہانے رکھنے گئیں تو وہ اور کلو دو معصوم بچوں کی طرح گلے میں باہیں ڈالے بے خبر سو رہے تھے۔ مچھر دانی درست کر کے کلو کی ماں برآمدے میں اپنی مخصوص پلنگڑی پر لیٹیں تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ ایک چھتنار برگد کی چھاؤں میں لیٹی ہیں۔ بے اختیار کانوں میں اپنی بارات کے تاشے تڑتڑانے لگے۔ انار پھلجھڑیاں چھوٹ کر دماغ میں جگنوؤں کی طرح پھیل گئیں۔ وہ مانجھ، چوتھی، بری ایک ایک کر کے ذہن کی پگڈنڈی پر گزرنے لگیں۔ عمر ہی کیا تھی۔ رحیم بھی تو کم سن ہی تھا۔ مہندی سے لال ہاتھ کئی دن یار دوستوں سے چھپائے پھرا تھا اور پھر گھر کی اندھیری کوٹھڑیوں اور سنسان چھتوں پر وہ جوان ہوئے۔ پھر کلو نے ان کونوں کھدروں کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ مگر بنتے ہی دنیا اجڑ گئی۔

کلو کی ماں کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ مرنے والے کی جوان چوڑی چکلی چھاتی سانس روکنے لگی۔ تھکے ہارے مسافر کی طرح کلو کی ماں نے اس غیر مُرئی چھاتی پر ماتھا ٹکایا۔ جو سنگ مرمر کی طرح سرد اور بے جان تھی۔ ایک انجانی گولی اس چھاتی کو

چیرتی ہوئی معصوم کلو اور بدنصیب ماں کے وجود کو پاش پاش کر گئی۔

نیند

ایک دم رات انتہا سے زیادہ سنسان اور تھکی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ وہی رات جو چند گھنٹے پہلے نشے میں چور' چوتھی کی دلھن کی طرح جگر مگر کر رہی تھی یکایک بوڑھی اور مریضہ بن گئی۔---- انہوں نے اپنے بازو پر سوئے نو عمر جوان کے بھاری سر کا بوجھ ذرا کھسکا کر اور قریب کر لیا۔ وہ بے سدھ سو رہا تھا۔ اس کی لمبی لمبی سڈول ٹانگیں مسہری سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ایک ہاتھ پہلو کے نیچے مڑا ہوا تھا۔ دوسرا بھاری شہتیر کی طرح انکے سینے پر پڑا ہوا تھا۔

کیا جی لگا کر سو رہا تھا نیک بخت! اگر اس کی سرمئی آنکھیں اس وقت کھلی ہوئی ہوتیں تو کتھئی بالوں کے گچھے اس کی پلکوں پر ٹک جاتے اس کے صندلی گالوں پر نصف رات کی سبزی چھلک آئی تھی۔ لب وا تھے اور وہسکی کی میٹھی میٹھی مہک آ رہی تھی۔

نو عمر لڑکا سو رہا تھا اور وہ جاگ رہی تھیں۔ اس کی گہری نیند پر انہیں شدت سے رشک آ رہا تھا۔ ان کے بازو پر رکھتے ہی وہ فوراً" سو گیا تھا اور خراٹے لینے لگا' بالکل دودھ پیتے بچے کی طرح ڈس کے خراٹے نرم و نازک و غنودگی کے سروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے شانوں پر مسلسل پر وقفے سے ایک ہلکی سی گرم لہر رینگ جاتی تھی۔

وہ جاگ رہی تھیں۔ کیوں کہ ان کے جسم سے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ کتنا دور تھا' کتنے سال درمیان میں گہری گہری کھائیوں کی طرح حائل تھے اور زندگی کی سنگلاخ ترین شنو کو بانہو میں جکڑے اس کے ہونٹ چوم رہا تھا۔ اور ان

کے برباد اور سنسان دل کو اس نیند کی دنیا سے دور اکیلا چھوڑ گیا تھا۔

ان کی نیند کا خزانہ ختم ہو چکا تھا۔ برسوں سے وہ لوتھ ہو کر سونے کا مزا بھول چکی تھی۔ اب نیند کی داؤں کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نے بڑی سختی سے انہیں گولیوں کی مقدار گھٹانے کی تاکید کی تھی۔ کبھی وہ دن تو تھے جب ان پر یلغاروں نیند کی دواؤں کا بھی ان پہ کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نے بڑی سختی سے انہیں گولیوں کی مقدار گھٹانے کی تاکید کی تھی۔ کبھی وہ دن بھی تو تھے جب ان پر الغاروں نیند ٹوٹ پڑا کرتی تھی۔ جاگنے کے لئے چائے اور کافی بھی بے کار ثابت ہوتی تھیں۔ گیارہ بجے سے ہی ان کی آنکھیں لڑکھڑانے لگتی تھیں۔ ایک بار تو وہ رقص کے درمیان میں اپنے پارٹنر کی بانہوں میں چند لمحوں کے لئے غافل ہو گئی تھیں۔ اگر ان کا پارٹنر اتنا قوی ہیکل نہ ہوتا تو وہ انہیں یوں بانہوں میں اٹھائے اٹھائے ہرگز نہ رقص کر پاتا۔

اور اگر انہیں اپنے پارٹنر کی یہ جواں مردی کی ادا بے طرح نہ بھا گئی ہوتی تو شاید آج انکی زندگی بالکل مختلف دھاروں میں بہہ رہی ہوتی۔ یہ جب کی بات تھی جب ان کی شادی کو چند ہی سال ہوئے تھے۔ اور جب تک ان کے شوہر اتنے باسی اور پرانے نہیں ہوئے تھے۔ یہ دونوں سوسائٹی میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اور اونچے طبقے کے زندہ دل کے لوگوں نے بڑے جوش و خروش سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ نئے بیاہے سلمان اور شنو کی جوڑی بھی خوب تھی سلمان سبک قد کے حسین و جمیل نوجوان تھے۔ ان کے آنکھوں میں معصومیت تھی آواز میں سحر تھا سوسائٹی کی اکتائی ہوئی بیگمیں بہت جلد ان کی بھولی بھالی صورت پر لٹو ہو گئیں۔ شہناز جنہیں سب پیار سے شنو کہا کرتے تھے بڑی البیلی واقع تھیں۔ اگر ان کا ناک نقشہ حسن کے مقررہ پیمانے سے تولا جاتا تو بڑے گھاٹے میں رہتیں ان کی پرسنیلٹی غضب کی تھی "اٹ" کی فراوانی تھی لانبے قد میں بلا کی لچک تھی۔ ایک تو جسم کا تو بہ شکن اتار چڑھاؤ اوپر سے ان کا انوکھا فیشنگ لباس سونے پر سہاگے کا کام کرتے تھے۔

اف وہ بھی کیا دن تھے جب لوگوں کی نگاہیں ان کے تعاقب میں بھٹکا کرتی تھی کچھ حاسد قسم کے لوگوں کا تو خیال تھا کہ سلمان صاحب کو شنو ڈارلنگ کی بدولت ہی اتنی ہی ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ کچھ احمق سمجھتے تھے کہ خوش خواتین سلمان کی وجہ سے شنو سے بہناپا جتانے میں پیش پیش تھیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب نیند ٹوٹ کر آتی تھی سر شام ہی سے آنکھیں میٹھی میٹھی ہونے لگتی تھیں۔ تب ان کا حسن دوبالا ہو جاتا اور لوگ انہیں کسی شرط پر نہ اٹھنے دیتے ----- پارٹیوں سے آکر کیسی دھواں دھار نیند آتی تھی۔ سلمان تو صبح دفتر چلے جاتے۔ وہ نرم نرم بستر پر مچل کر سوتے جاتیں۔ بمشکل کھانے کے وقت پر اٹھتیں پر نیند کھٹکے جاتی' آنکھیں نڈھال ہوئی جاتیں۔ نہا دھو کر ذرا آنکھیں کھلتیں پھر تھوڑی سی بیئر کے ساتھ کھانا کھاتے ہی جسم کے جوڑ جوڑ میں نیند رینگنے لگتی پڑھنے کی کوشش کرتیں تو کتاب بار بار منہ پر گرنے لگتی۔

پر اب جیسے نیند کی تھیلیاں ہی سوکھ گئی ہوں۔ وقت شیطان کی آنت بن کر ہولے ہولے سرکتا ----- اور نیند نہ آتی۔ تبھی بھی تو ایسی اچٹتی ہوئی بیگانی سی' کہ سو کر بھی بے خوابی کا کھردرا احساس طاری رہتا۔

ان کا ہاتھ دب جانے سے دوران خون رک کر سن ہو گیا۔ آہستہ آہستہ انہوں نیند سے بوجھل سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچا شہتیر جیسے بازو کو جسم کی طاقت لگا کر سرکایا۔ اور کہنی کے بل ہو کر وہ ملٹری کے نوجوان کو تکنے لگیں۔ ان ہنگامہ خیز چند گھنٹوں میں اچھی طرح اس کے نقش و نگار کو بھی نہیں دیکھ پاتی تھیں! وہ تھا بھی بیکل بوٹی جوانی اس کی رگ رگ میں قلانچیں بھر رہی تھی۔ نچلا بیٹھتے اسے تھکان ہوتے لگتی تھی - انہوں نے زندگی میں بڑے بڑے شرابی دیکھے تھے ہنستے ہوئے' روتے ہوئے ----- الٹیاں کرتے ہوئے۔ کپڑوں میں رفع حاجت کرتے ہوئے مگر ایسا شرابی انہوں نے کبھی نہ دیکھا۔ جتنی وہ چند گھنٹوں میں پی گیا دوسرے کئی دن میں نہ پی پاتے پھر لطف یہ کہ نہ پیروں میں لرزش نہ زبان میں لکنت ----- ان کا جوڑ ٹوٹ گیا' مگر وہ چاق و چوبند رہا' پیتا رہا' رقص کرتا رہا۔

اس ایک شام اس نے جانے کتنے میل رقص کر ڈالا ہو گا۔

شروع ہی میں وہ اتنا پے ہوئے تھا کہ انہوں نے مسز دوراب جی سے کہہ کر ہی اس جنگلی سے بچنا چاہا۔ اس بھوت سے تو کوئی سانڈنی ہی نپٹ سکتی تھی۔ مگر بدقسمتی کہ وہ دوسری خواتین پہلے یہ مشغول تھیں۔ ورنہ اس چھوکرے کے لئے لو بقول مسز دوراب جی انہیں الٹے دام مل جاتے پھر تھوڑی دیر جرا" بھگتنے کے بعد انہیں اس پر پیار آگیا وہ اکیلا تھا۔ بہت ہی اکیلا تھا۔ اب وہ کہیں نہیں جائے گا۔ وہ نوکری چھوڑ دیگا۔ ساری دنیا کو گولی مار دے گا۔ بس وہ اور شہباز ساری عمریوں ہی چکنے فرش پر ناچتے رہیں گے۔ یہ فیصلہ اس نے چند گھنٹوں کے بعد کرلیا تھا۔

جھک کر انہوں نے کھڑکی میں سے آتی ہوئی صبح کاذب کی دودھیا روشنی میں نیند میں متوالے فوجی نوجوان کو ایک بار پھر دیکھا سوتے میں اس نے پٹ کر سوئے ہوئے بچے کی سکی بھری جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔ محاذ سے زندہ سلامت آنے والے بھی اپنی روح کا کوئی نا معلوم سا حصہ وہیں خاک اور خون میں تڑپتا چھوڑ آنے والے ہیں اور جب نیند کی رانی انہیں بے دست و پا بنا کر خواب میں وہیں گھسیٹ لے جاتی ہے تو وہ معصوم بچوں کی طرح بسورنے لگتے ہیں۔

"فرید بھی تو سوتے میں یوں ہی منہ بسور دیا کرتا تھا-----" انہوں نے سوچا۔

فرید کی یاد بجلی بھری تلوار کی طرح چمک کر دل میں ترازو ہو گئی۔ وہ کتنی کم سن تھیں جب فرد پیدا ہو گیا تھا۔ کیا گندا سا لال بوٹی جیسا کہ دیکھ کر ابکائی آگئی تھی' پلپلے تتلی کے کیڑے کو دیکھ کر ہی ان کا جی متلانے لگا تھا۔ ویسے بھی فریدہ کی آمد ہی ان کی سوشل لائف کے حق میں موت کا پیغام ثابت ہوئی۔ ڈنر پارٹیوں میں پیٹ پھلائے کیسے جاتیں!

کتنا جھوٹ بولتے ہیں یہ دنیا والے کہ جب ماں کی چھاتی منہ میں لیتا ہے تو روم روم میں ممتا جاگ اٹھی ہے۔ انہیں تو ایسی تکلیف ہوئی تھیں کہ چیخیں نکل گئی تھیں۔ پھر لاکھ نرسوں نے کوشش کی۔ انہوں نے بچے کو جسم سے نہ چھونے

دیا۔ فرق ہی کیا پڑتا تھا۔ وہ تھا ہی کمزور۔ اپنے باپ پہ گیا تھا۔

فرد ان کے پیروں کی بیڑی نہ بن سکا۔ امی جان اسے اپنے ساتھ رامپور لے گئیں۔ سچ پوچھئے تو وہ ان کا ہی بیٹا لگتا تھا۔ اتنی سی عمر میں ماں بن گئی تھیں مگر یہ کردار ان پر قطعی نہ سجا تھا۔ انہیں اس سے اماں کہلواتے بھی عجیب سا لگا اور جب وہ شنو کہتا تو بیٹے کے منہ سے اپنا پیار کا نام سن کر انہیں اس پر کچھ کچھ پیار آنے لگا تھا۔

یہ وہی زمانہ تھا جب تک نیند ان سے نہیں روٹھی تھی۔ اسی ہرجائی نیند نے ایک دن رقص کے بیچ میں ان کی بدمست انکھڑیوں میں سما کر انہیں ان کے پارٹنر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ وہ مضبوط بانہوں والا پارٹنر تھا اس کا کہنا تھا کہ وہ انہیں باہر گھاس پر لٹانے گیا تھا۔ یہ ویسے اس کی نیت کچھ زیادہ بد نہ تھی۔ مگر اتنی سی بات پر سلمان صاحب جذباتی ہو گئے۔ ورنہ وہ ان کے پارٹنر کا جبڑا نہ توڑ بیٹھتے وہ اتفاق سے ان کا افسر اعلی بھی تو تھا۔ اگر ایک افسر اعلی از راہ کرم اپنے ماتحت کی بیوی کو جو رقص کے درمیان لمبی تان لینے پر مصر ہو..... گھاس پر لٹا رہا ہو تو وہ جبڑا اکھڑوانے کا ہرگز مستحق نہیں۔ ہر ایک جانتا ہے کہ کسی کو گھاس پر لٹانے میں کیسے کیسے آسن مارنا ہی پڑتے ہیں۔ اگر سلمان نے اتنے چھچھور پن سے اپنی حماقت کا اس قدر شاندار ثبوت نہ دیا ہوتا تو شادی بات آگے نہ بڑھتی اور انہیں باس کی ضرورت سے زیادہ دلجوئی نہ کرنی پڑتی۔

باس یعنی مسٹر دین قوی ہیکل تو تھے مگر قطعی گوریلے کی طرح حسین تھے۔ کالے بھسم! بالکل چوکھونٹے تماکو کے پنڈے کی شکل کے۔ ان کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ انسان کے آباء و اجداد و بندر تو تھے مگر ان کا گینڈے سے بھی کو ناطہ رہا ہو گا۔ بڑے بڑے کان------ سلمان سے قد میں ایک دو انچ کم ہی ہوں گے۔ مگر چوڑا ان میں دو ڈھائی گنا۔

شہناز کو بدصورتی سے ہمیشہ گھن آتی تھی۔ مگر یہ کالا دیو بزبری کو نہ جانے کیوں بھا گیا تھا۔ ویسے شہناز کے خرچے زیادہ' آمدنی کم تو ہمیشہ سے تھی۔ فلیٹ بھی

مسٹر دین کی عنایتوں کی بدولت مل گیا تھا سوسائٹی میں ساکھ قائم رکھنے کے لئے دعوتیں بھی کرنا پڑتی تھیں۔ کپڑے لتے کی ضرورت بھی ہوتی تھی۔ پینے پلانے میں بھی خاصا خرچ آجاتا تھا۔ ان کے پاس زیادہ تر جہیز کی ساڑیاں تھیں یا اماں جانی بھیجتیں رہتی تھیں۔ مگر عموماً "اپ ٹو ڈیٹ نہ ہوتی تھیں۔ دوسرے مسٹر دین میں نہ جانے کونسا جادو تھا کہ وہ ان کے ہاتھوں میں موم کی طرح پگھل جاتی تھیں۔ انہیں پیار کرنے کے طریقے آتے تھے۔

اس کے علاوہ اس معاملے کو بڑھانے چڑھانے میں کچھ سلمان کا بھی ہاتھ تھا۔ ان کی عاشق مزاجیاں اپنی جگہ کچھ کم نہ تھیں۔ حلیمہ دین ان کی کلاس فیلو رہ چکی تھیں۔ انہیں کی سفارش سے اتنی مزے دار نوکری ملی ہوئی تھی۔ جس میں دعوتیں اور پکنکیں زیادہ اور کام بالکل نہیں کے برابر۔

جب فرید ہونے والا تھا تو سلمان صاحب اپنے باس کی بیگم کی تنہائیاں دور کیا کرتے تھے۔ کیوں کہ دین صاحب یورپ کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ اس لئے انہیں فرید سے پہلے ہی چڑ ہو گئی تھی اور ان کی ممتا جاگ نہ سکی۔ اگر وہ پیٹ میں نہ ہوتا تو حلیمہ دین سلمان کو ہل اسٹیشن نہ لے جا پاتیں۔ اچھی طرح سے زچہ خانہ کی زردی بھی نہیں مٹی تھی کہ سلمان انہیں امی جان کے سپرد کر کے خود اپنے باس کی گرمی سے اکتائی بیگم کو لے کر پہاڑ پر چلے گئے۔

"ڈارلنگ یہ سب نوکری کی خاطر کرنا پڑ رہا ہے۔" انہوں سمجھایا تھا۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور انتقاماً" مسٹر دین کے آنے کے بعد وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ امی جان کو ہمیشہ سے سلمان سے چڑ آتی تھی ایک تو ان کی تنخواہ شہناز جیسی لڑکی کے اسٹینڈرڈ کی نہ تھی۔ دوسرے گدھے نہ شنو کو اس پھرتی سے ماں بنا ڈالا۔ کہ بچی کو ذرا بھی کھیلنے کھانے کا موقع نہ ملا۔ لے دے کر ان کی ایک ہی اولاد تھی مگر وہ بھی اتنی بدھو کہ سلمان کی خالی خولی پاپلوسی میں آکر راجوں اور مہاراجوں کے پیغامات کھو دیئے۔ اشاروں کنایوں میں انہوں نے شہناز کو قائل کر دیا کہ حلیمہ اور دین کے ویسے بھی نہیں بنتی۔ بہترین موقع ہے۔ اگر بات بن جائے

تو دلدر دور ہو سکتے ہیں۔ اس لئے جان بوجھ کر وہ فرد کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ آہ! فرد۔۔۔۔ آجد اگر وہ زندہ ہوتا تو اس کی لمبی ٹانگیں بھی اس سوئے ہوئے فوجی کی طرح قطعی مسہری سے باہر نکل آتیں۔ مگر فرد کی ٹانگوں کے نصیب میں مسہریاں نہیں، برما کے جنگلوں کی دلدل تھی۔

مگر شبانہ کی پیدائش پر ایک دم اس کی ممتا جاگ گئی اس سے انہیں قطعی کوفت نہ ہوئی۔ حالانکہ فرید کے مقابلہ میں وہ نہایت بھونڈی اور بدوضع تھی مسٹر دین کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ امی جانی کا خیال تھا اگر بیٹا ہوتا تو شاید وہ پگھل جاتے مگر وہ تو دولت بنانے میں مشغول تھے کہ انہیں کسی سے شدید محبت کرنے کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ شہناز نے بہت چاہا تھا کہ بیگم کو طلاق دے کر ان سے شادی کر لیں مگر وہ اس اسکینڈل کے لئے تیار نہ ہوئے۔ ان کی بیوی ان کے بزنس میں نصف کی ساجھے دار تھیں۔ سارا روپیہ بھی ان کے قبضے میں تھا۔ ویسے دونوں کی اب بھی سلجھی ہوئی دوستی قائم تھی۔ ایک کو دوسرے کے نجی مالمات پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ سوسائٹی میں وہ اب بھی میاں بیوی کی حیثیت سے ایک باوقار مقام رکھتے تھے۔ سرکاری و نیم سرکاری دعوتوں میں وہ کبھی شہناز کو نہیں لے گئے۔ وہ ان کا نجی معاملہ ہی رہا۔ سلمان کو تو اعتراض نہ تھا مگر انہوں نے خود ہی شبانہ کا بار ان کے کندھوں پر نہ ڈالا۔ اور نہ وہ اسے اپنی نظروں سے دور رکھ سکیں۔ انہوں نے اس کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کی نرس مقرر کر دی تھی اور اسے ایک شاندار ہوٹل میں رکھتی تھیں جس کا خرچہ بڑی دریا دلی سے دین برداشت کرتے تھے۔ اور جب وہ سب سے چھپ چھپا کر چوروں کی طرح اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو سینے سے لگانے ہوٹل جاتیں تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی سنسنی خیزی ناول کی بدنصیب مگر رومینٹک ہیروئن ہیں۔ وہ اسے گود میں لے کر روتیں۔ عام طور پر اس درد ناک سانحہ کی خبر دین تک پہنچ جاتی اور وہ اشک شوئی کے لئے ساڑھیوں کے بنڈل بھجوا دیتے مگر ان کے آنسو پھر بھی نہ تھمتے۔ آہ ظالم سماج نے انہیں بچی سے جدا کر رکھا تھا۔ وہ اپنی لاڈلی کو اعلانیہ چوم نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے اسکے گرد ایک درد ناک

المیہ تیار کرلیا تھا۔ جس کی ہیروئن بن کر وہ خود کو نہایت رومنٹیک نظر آتیں۔

مگر ان میں درمیانہ درجہ کی بہت سی کوہیاں باقی تھیں۔ مسٹر اور مسز دین کی طرح وہ اپنے شوہر سے پرخلوص تعلقات نہ قائم کر پائیں اور نہ وہ حلیمہ دین کے سے خندہ پیشانی سے پیش آسکیں۔ جب بھی وہ یہ دونوں جوڑے کسی پینے پلانے کی محفل میں اکٹھے ہو جاتے دو چار ہی پیگ کے بعد جلی کٹی باتیں شروع ہو جاتیں۔ حالانکہ یہ کوئی ایسی بھیانک بات نہ تھی۔ عورتیں جیسے ڈوپٹہ بدل کر بہن بن جاتی ہیں اسی طرح حلیمہ اور شہناز شوہر بدل بہنیں تھیں۔ شریف بیویاں ایسے موقعوں پر ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو کر اچھی بھلی فضا کو مکدر نہیں کیا کرتیں۔ پھر ایک دن حالات نے قلابازی کھائی' مسٹر دین اور مسز دین میں ایک دم ملاپ ہو گیا۔ اور وہ انگلستان روانہ ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہیں اپنا بزنس ایک سندھی کے ہاتھ بیچ دیا جس کا اکاؤنٹ انگلستان میں تھا کچھ الٹ پلٹ کے بعد دین فیملی نے ہجرت ہی میں بہتری سمجھی' نئے باس نے مسٹر سلمان کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا۔ اور پلک جھپکاتے میں شہناز اور ان کے شوہر پتھریلی بنجر زمین پر ایڑیاں رگڑتے نظر آئے۔

کیا قیامت کا وقت تھا چھ مہینے کا فلیٹ کرایہ نہیں دیا تھا۔ دوست احباب سب مسٹر دین کی دی ہوئی نوکری سے بنے تھے' وقت بگڑا تو وہ بھی پر سے غائب ہو گئے۔ اس وقت اگر مسز دوراب جی نے جو اپنے مرحوم شوہر کی شراب کی دوکان کو بڑی مستعدی سے چلا رہی تھیں۔ آکر ڈوبتی ناؤ کو اپنی دولت کے چھینٹوں سے سہارا نہ دیا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ مالا بار ہل پر ان کا شاندار فلیٹ تھا۔ اس پر کچھ پولیس کو اعتراض ہونے لگا۔ وہ فلیٹ انہوں نے پگڑی پر دے دیا اور خود شہناز کے فلیٹ میں ایک کمرہ لے کر رہنے لگیں۔ انہوں نے حالات کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد چھ مہینے کا کرایہ ادا کر دیا۔ ایک کمرہ چھوڑ کر سارے فلیٹ پر قبضہ ہو گیا۔ اس عرصے میں سلمان کے زخمی دل پر خورشید سہانے مرہم رکھنا شروع کر دیا تھا۔ سنا ہوائی جہاز کے حادثے میں جانباز پائلٹ کی موت مر کر اپنی غمگین بیوہ کے لئے اچھی خاصی پنشن کا انتظام کر گیا تھا۔ مسز دوراب جی نے ایک کمرہ فلیٹ میں

اسے دے رکھا تھا۔ کچھ دن یہ انوکھا خاندان بڑے مزے سے رہا سلمان اور خورشید کی جوڑی بن گئی۔ مسز دوراب جی شہناز کو بڑی دلچسپ ہستیوں سے متعارف کرانے لگیں۔ کبھی افسران کے غول بوتلوں کے بکس لے کر آجاتے۔ کبھی جہازی قہقہے لگاتے آن موجود ہوتے۔ بعض کے ساتھ خواتین بھی ہوتیں کچھ کو مسز دوراب جی کی سہیلیاں سنبھال لیتیں۔ خوب قہقہے چلتے ریکارڈ لگا کر ڈانس کئے جاتے چوما چاٹی سے آگے بات نہ بڑھتی یہ اور بات تھی کہ کبھی کوئی جوڑا اٹھ کر تھوڑی دیر کے لئے غائب ہو جاتا۔ اور یوں دن گزرتے رہے۔---- زندگی چلتی رہی۔ خورشید اور سلمان کی بڑی جانی پہچانی سی دوستی تھی۔ اگر وہ شادی کر لیتی تو پنشن بند ہو جاتی جو خاصی معقول تھی۔ اور سلمان کھرا عشق کرنا جانتے تھے' گرہست بنانا ان پر ظلم کرنا تھا۔ جب سے نوکری چھوٹی تھی خورشید ہی ان کا خرچ اٹھا رہی تھی۔

یہ خورشید کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا شوہر اس کے لئے پنشن کا انتظام کر کے مرا تھا' مگر شہناز کا تو کوئی سہارا نہ تھا۔ امی جان نے فرد کو لائق فائق بنا دیا تھا۔ شبانہ کا ہوٹل کا خرچہ اب قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ المیہ بھی کچھ باسی ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے اسے امی جانی کے سپرد کر دیا تھا کچھ رقم جو مسٹر دین چلتے چلتے انہیں تھما گئے تھے وہ تنہائی اور وحشت دل دور کرنے کے سلسلے میں ختم ہو گئی کچھ مسز دوراب جی کی شراب کی بوتلوں میں گئی۔ کچھ ریس کورس پر ڈوبی۔ بمبئی جیسے شہر میں چند ہزار کی حیثیت ہی کیا؟

یہ وہ زمانہ تھا جب فرد کی اچانک موت نے انہیں اندھے منہ گرا دیا تھا۔ نہ جانے اتنے دن کی سوئی ماتا کیوں ایک جھٹکے سے جاگ اٹھی فرد کے رخصت ہوتے وقت وہ ایلوار' اجنتا کا فن ملاحظہ کرنے اپنے دوستوں کے ساتھ گئی ہوئی تھیں جدائی کا احساس بھی نہ ہوا تھا مگر موت نے انہیں کچل کر رکھ دیا۔ مہینوں وہ گم رہیں۔ اگر ایک لمحہ کو بھی انہیں ہوش آجاتا تو پاگل ہونے لگتیں۔

فرد کے خیال پر وہ ایک دم ماضی کی دم گھونٹنے والی فضا سے لوٹ آئی پہلو میں پڑے ہوئے نوجوان نے ایک لمبی چوڑی کروٹ لی۔ اور چاروں ہاتھ پیر پھینک

کر پھسل گیا۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی کچھ اور دودھیا ہو گئی تھی۔ اس کا سڈول جسم ساری مسہری پر قابض تھا۔

"شنو ڈارلنگ ----- مائی سوئٹ بے بی -----" اس نے ان کے کان کے لو چباتے ہوئے ان سے شادی کی درخواست کی تھی۔ اس کے گھولتے ہوئے الفاظ سانپ کی پھنکار کی طرح اب تک ان کے کانوں میں رینگ رہے تھے۔

شادی!

ایک ایک کر کے نہ جانے کتنے برسوں کا بوجھ ان کے کاندھوں سے سرک گیا تھا۔ انہوں نے سسکی بھر کر خود اس کی کڑیل بانہوں میں بے سدھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہت تھک گئی تھیں۔ اگر کچھ دن اور نیند نہ آتی تو ان کی ہستی بارود کے ڈھیر کی طرح بھک سے اڑ جائے گی۔ کتنی وسعت تھی نوجوان کے چوڑے سینے میں اس کی تازگی کے گھنے سائے میں ان کی خشک ہستی لہلہا اٹھے گی۔ انہوں نے تھکے ہارے مسافر کی طرح نڈھال ہو کر اپنا منہ اس کے چٹیل سینے پر پٹکا دیا اور ننھی سی یتیم بچی کی طرح سسکنے لگیں۔ فوجی جوان نے سوتے میں جیسے کتے کو پچکارا۔

"بے بی' بے بی ----- پچ ----- مائی سوئٹ بے بی ڈارلنگ!"

وہ پھر بڑبڑایا اور دوسرے لمحے خوابوں کی دنیا میں چوکڑیاں بھرنے لگا۔ ان کی کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ آنکھوں میں بھوبل کھٹک رہی تھی دل ایک بھٹکے ہوئے پنچھی کی طرح پھڑک رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتی رہیں اور آنسو بہاتی رہیں۔

وہ اس ہنگامے کی تنہائی سے گھبرا چکی تھیں فلیٹ پر قہقہوں سے گونجا کرتا مگر ان کے دل کی ویرانی اور بڑھتی جاتی۔ مسزدوراب جی نہ جانے کہاں مغربی سیاحوں کے غول کو گھیر لائیں جب سے شراب بندی کا قانون نافذ ہوا تب سے فلیٹ ایک نہایت شائستہ قسم کا قحبہ خانہ بن گیا تھا۔ جہاں گاہک بہ طور دوستوں کے آتے پرمٹ کی شراب تو پہلے ہی حملے میں ختم ہو جاتی پھر مسزدوراب جی کی بوتلیں کھلتیں اور داد عیش دی جاتی۔

کئی بار انہوں نے اکتا کر شادی کرنی چاہی' ایک جان چھوڑ ہزار جان عاشق ہوئیں اپنا تن من دھن سب لٹا دیا۔ مگر شکار ہمیشہ رسیاں تڑا کر بھاگ نکلا اور جب کوئی یوں انہیں جل دے کر نکل جاتا کرتا تو ان پر مردنی کے دورے پڑنے لگتے ----- پرانی پیچش عود کر آتی خون کا دباؤ گر جاتا۔ اور وہ ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کے لئے شراب کا سہارا لیتیں۔ ایسے موقعوں پر مسزدوراب جی ان پر خوب خوب چھینٹے کستی' ایک دفعہ تو اس نے انہیں اتنا سلگایا کہ جوتی لے کر انہوں نے اس کا پلیتھن نکال دیا۔ وہ بھی غصے میں آ کر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی شہناز میں ایک عظیم الشان انقلاب واقع ہوا۔ ان کی ملاقات ایک جبروت قسم کے انقلابی شاعر سے ہو گئی۔ اور وہ بڑے شد و مد سے ملک میں انقلاب لانے پر تل گئیں۔ حرامی بچی کی ماں کی حیثیت سے وہ خود کو بے انتہا انقلابی سمجھتی تھیں۔ آرٹ اور کلچر کی خدمت کے سلسلے میں انہیں "فردا" "فردا" کئی فنکاروں پر عاشق ہونے کا موقع ملا۔ مسٹر دین کی عطا کی ہوئی ساڑھیاں بالکل بیکار ہو گئیں ان ہی دنوں انہوں نے نہایت باغیانہ اور میلی ساڑھیاں پہن کر واقعی مزدوروں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس ماحول میں نہ تو انگریزی شراب کچھ بجتی اور نہ آسانی سے مہیا کی جا سکتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے نہایت سستی دارو پر دست شفقت پھیرنا شروع کر دیا۔

اف کیا ہنگامہ خیز دن تھے وہ بھی میلے میلے فنکاروں سے ان کا فلیٹ کھچا کچھ بھرا ہوتا۔ سستے ٹھرے کی لو سے فضا بس جاتی ----- تب علم و ادب فلسفہ اور شاعری پر مباحثے ہوتے جو عملاً "جوتم پیزار" پر ختم ہوتے۔

مگر جلد ہی انہیں قائل ہونا پڑا کہ ننگے بھوکے فنکاروں کی صحبت میں روحانی غذا کی فراوانی تو ہو سکتی ہے مگر مکان کا کرایہ اور گھر کا خرچہ اگر ان کی کھال بھی اتار لی جائے تو بھی نہیں چل سکتا مجبوراً" انہوں نے مسزدوراب جی سے میل کر لیا۔ وہ شاید منتظر ہی بیٹھی تھیں فوراً" راضی خوشی من گئی اس نے اجڑے ہوئے فلیٹ کو دوبارہ سنوارا۔ اور پھر وہی صوفی قسم کے دوست اور ولایتی شرابیں چلنے لگیں۔ سیاحوں کے جمگھٹے رہنے لگے۔

اور یہ شالی کا گبرو اسی کے سلسلے کی کڑی تھا۔

آنسوؤں کی چلمن میں سے انہوں نے نیند کے ماتے جوان کو دیکھا اس کی ناک اور اوپر کے ہونٹ پر ننھی ننھی پسینے کی بوندیں ہیرے کی کینوں کی طرح دمک رہی تھیں۔ انہوں نے جھک کر اپنے سرد اور باسی ہونٹ اس کے دہانے کے کونے پر رکھ دیے جہاں جاگتے میں ایک ننھا سا گڑھا مسکرانے لگتا تھا۔

پو پھٹنے لگتی تھی---- کوئی دم میں سورج کی بے رحم سلاخیں ان سوئی ہوئی انکھڑیوں میں بھنسے لگیں گی اور فوجی جوان جاگ پڑے گا۔ انہوں نے ایک بار جی بھر کے لاڈلے کو دیکھا اور اس پر چادر ڈال دی۔

ایک لمحہ کو پلک جھپکائے بغیر وہ تھکے ہوئے جسم کو گھسیٹ کر بستر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

آئینے میں وہ اپنے چہرے کے ویران کھنڈروں کو دیکھ کر لرز اٹھیں۔ اس کے جاگنے سے پہلے مرمت کرنا ہوگی۔ وہ بے پیر کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ جاگ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس نے انگڑائی بیچ میں توڑ دی اور گھبرا کر چادر اپنے گرد سمیٹ لی۔ اور اپنی جھینپی ہوئی مسکراہٹ کو سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے چھپانے لگا۔

"بے بی---- ؟" اس نے ہکلا کر کہا اور وہ پتھر کا بت بن کا ٹھٹک گئیں۔

"بے بی کہاں ہے؟" آواز ان کے گلے میں سہم کر رہ گئی۔

"ہاں---- " وہ غور سے انہیں پہچان کر بولا---- " آپ کی بیٹی ہے نا؟" کتنی شکل ملتی ہے آپ دونوں کی!" وہ انگریزی میں بولا۔

"کیا بک رہے ہو؟" انہوں نے غرور سے تن کر کہا۔

"میں اتنا کمینہ نہیں ہو میڈم۔ ہم ــ شادی کرلیں گے۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے تکنے لگیں۔ پھر جلدی سے میک اپ کا بیگ اٹھا کر دونوں ہاتھوں سے بھینچے لوٹ آئیں۔

انہوں نے ایک بار پھر اپنی شکل آئینے میں دیکھی اور اس سنسان کھنڈر کے پیچھے کمسن حسینہ کو ڈھونڈنے لگیں۔ جسے نیم تاریک کمرے کی دھواں بھری فضا اور

شراب کے نشے نے اس نوجوان کی بہکی ہوئی آنکھوں میں ایک شام کے لئے جنم لیکر صبح کو قریب اور کھنڈر میں دفن ابدی نیند سو رہی تھی۔ انہوں نے میک اپ کا بیگ دور کونے میں پھینک دیا اور آنسوؤں س چھلکتے قہقہے لگانے لگیں۔

ناشتے پر سوجی سوجی غلافی آنکھوں والا نوجوان بڑی بے چینی سے بے بی کے قدموں کی چاپ سننے کے لئے بے قرار تھا۔ باربار وہ ان کے نقوش میں اس کھوئے ہوئے خواب کو ڈھونڈ پاتا اور خود ہی جھنپنے لگتا۔

"جانے سے پہلے صرف چند منٹ کے لئے میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

اس کے لہجہ کی مٹھاس ان کے کلیجے میں رس گھول گئی۔ انہیں لجاجت پر پیار آگیا۔

"تم اس سے نہیں مل سکتے۔" انہوں نے بڑی مشکل سے جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔

"کیوں؟---- مگر---- میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"پلیز---- ناشتہ ختم کیجئے اور تشریف لے جایئے۔" انہیں غصہ آنے لگا۔ جیسے واقعی اس نے ان کی معصوم بچی کو خراب کردیا ہو۔

اس نے ناشتہ نہیں۔ سر پکڑے خاموش پلیٹ پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

"تھوڑی سی وہسکی مل سکے گی؟" اس نے دونوں ہتھیلیوں سے کنپٹیاں دبائیں۔

"نہیں----" وہ بڑی درشتگی سے بولیں۔

جاتے وقت اس نے بڑے رقت بھری آواز میں التجا کی۔

"بے بی سے کہنا۔ میرا انتظار کرے۔ دورے سے واپس لوٹتے وقت میں پھر آؤں گا ---- شادی کے بعد میں اسے لدھیانہ لے جاؤں گا----" اس نے احمقوں کی طرح آنکھیں جھپکا کر آنسو پی لئے۔

جب وہ چلا گیا تو وہ دیر تک افق کے اس پار بے بی کو نوجوان کی مضبوط بانہوں میں سوتا ہوا دیکھتی رہیں۔ بمبئی کے ہنگاموں سے دور---- اس مہذب قحبہ خانہ اور مسز دوراب جی کے چنگل سے آزاد---- نت نئے سیاحوں کی گرفت

سے باہر----- کھلے کھیتوں کی مہکتی ہوئی شبنم میں نہائی ہوئی کچی کچی دھرتی کی گود میں----- دو نینوں کے متوالے جوان جسم، گیندے اور چنبیلی کے گوندے ہوئے دو ترو تازہ گجروں کی طرح ایک دوسرے میں الجھے ہوئے----- ان کی بے رونق آنکھوں میں گھٹے ہوئے آنسوؤں کی طرح کھٹکتے رہے اور نیند ان کی بوڑھی آنکھوں میں زہر گھولکر نہ جانے کہاں جا سوئی تھی؟

❀❀❀

ننھی کی نانی

ننھی کی نانی کا ماں باپ کا نام تو اللہ جانے کیا تھا- لوگوں نے کبھی انہیں اس نام سے یاد نہ کیا- جب چھوٹی سی گلیوں میں ناک سڑسڑاتی پھرتی تھیں تو بفاطن کی لونڈیا کے نام سے پکاری گئیں- پھر کچھ دن "بشیرے کی بہو" کہلائیں پھر "بسم اللہ کی ماں" کے لقب سے یاد کی جانے لگیں- اور جب بسم اللہ جاپے کے اندر ہی ننھی کو چھوڑ کر چل بسی تو وہ "ننھی کی نانی" کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں-

دنیا کا کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جو زندگی میں "ننھی کی نانی" نے اختیار نہ کیا- کٹورا گلاس پکڑنے کی عمر سے وہ تیرے میرے گھر میں دو وقت کی روٹی اور پرانے کپڑوں کے عوض اوپر کے کام پر دھرلی گئیں- یہ اوپر کا کام کتنا نیچا ہوتا ہے- یہ کچھ کھیلنے کودنے کی عمر سے کام پر جوت دیئے جانے والے ہی جانتے ہیں- ننھے میاں کے آگے جھنجھنا بجانے کی غیر دلچسپ ڈیوٹی سے لے کر بڑے سرکار کے سر کی مالش تک اوپر کے کام کی فہرست میں آجاتی ہے-

زندگی کی دوڑ بھاگ میں کچھ بھنومنا بھلنا بھی آگیا اور زندگی کے کچھ سال ماما گیری میں بیت گئے- پر جب دال میں چھپکلی بگھار دی اور روٹیوں میں مکھیاں پرونے لگیں تو مجبورا" ریٹائر ہونا پڑا- اس کے بعد تو ننھی کی نانی بس لگائی بجھائی کرنے ادھر کی بات ادھر پہنچانے کے سوا اور کسی کرم کی نہ رہیں- یہ لگائی بجھائی کا پیشہ بھی خاصہ منافع بخش ہوتا ہے- محلّہ میں کھٹ پٹ چلتی رہتی ہے- مخالف کیمپ میں جا کر اگر ہوشیاری سے مخبری کی جائے تو خوب خاطر مدارات ہوتی ہے-

لیکن یہ پیشہ کے دن چلتا' نانی لتری کہلانے لگیں اور دال گلتی نہ پا کر نانی نے آخری اور مفید ترین پیشہ یعنی مہذب طریقہ پر بھیک مانگنا شروع کر دی۔

کھانے کے وقت نانی ناک پھیلا کر سونگھتیں کہ کس گھر میں کیا پک رہا ہے۔ بہترین خوشبو کی ڈور پکڑ کر وہ گھر میں آن بیٹھتیں۔

"اے بیوی گھیاں ڈالی ہیں گوش میں۔" وہ بے تکلفی سے پوچھتیں۔

"نہیں بوا گئیں نگوڑی آج کل گلیں کہاں ہیں۔ آلو ڈالے ہیں۔

"اے سبحان اللہ۔ کیا خوشبو ہے۔ اللہ رکھے بسم اللہ کے باوا کو آلوؤں سے عشق تھا۔ روز یہی کہ بسم اللہ کی ماں آلو گوش جو آنکھوں سے بھی دکھ جاوے...... اے بیوی کو تھمیر چھوڑ دیا؟" وہ ایک دم فکر مند ہو جاتیں۔

"نہیں بوا کو تھمیر نگوڑا سب مارا گیا موا سقے کا کتا کیاری میں لوٹ گیا۔"

"ہے ہے بغیر کو تھمیر کے بھلا آلو گوش کیا خاک مزہ دے گا۔ حکیم جی کے یہاں منوں لگا ہے۔"

"اے نہیں نانی حکیم جی کے لونڈے نے کل شبن میاں کی پتنگ میں کنکی لگا دی۔ اس پر میں نے کہا خبردار جو بچھے پہ قدم رکھا تو......"

"اے میں کوئی تمہارے نام سے تھوڑی مانگوں گی۔" اور نانی برقع سنبھال سلیپریں سٹپٹاتی حکیم جی کے یہاں جا پہنچتیں۔ دھوپ کھانے کے بہانے کھسکتی کھسکتی کیاری کے پاس منڈیر تک پہنچ جاتیں۔ پہلے ایک پتی توڑ کر سونگھنے کے بہانے چٹکی میں مسلتیں۔ حکیم جی کی بہو کی آنکھ بچی اور مارا نانی نے کو تھمیر پر کٹا۔ کو تھمیر مہیا کرنے کے بعد ظاہر ہے دو نوالے کی حقدار ہو ہی جاتیں۔

نانی اپنے ہاتھ کی صفائی کیلئے سارے محلہ میں مشہور تھیں۔ کھانے پینے کی چیز دیکھی اور لقمہ مار گئیں۔ بچے کے دودھ کی پتیلی منہ سے لگائی دو گھونٹ غٹ لیے۔ شکر کی پھنکی مار لی۔ گڑ کی ڈلی تالو سے چپکا لی مزے سے دھوپ میں بیٹھی چوس رہی ہیں۔ ڈلی اٹھائی نیفے میں اڑس لی۔ دو چپاتیاں لیں اور آدھی نیفے کے ادھر آدھی ادھر اوپر سے موٹا کرتا آہستہ آہستہ حسب معمول کراہتی کو نکتی کھسک

گئیں۔ سب جانتے تھے پر کسی کو منہ کھولنے کی ہمت نہ تھی کیونکہ نانی کے بوڑھے ہاتھوں میں بجلی کی سی سرعت تھی اور بے چبائے نگل جانے میں وہ کوئی عیب نہ سمجھتی تھیں۔ دوسرے ذرا سے شے پر ہی فیل مچانے پر تل جاتی تھیں اور اتنی قسمیں کھاتی تھیں۔ قرآن اٹھانے کی دھمکیاں دیتی تھیں کہ توبہ بھلی۔ اب کون ان سے جھوٹا قرآن اٹھوا کر اپنی قبر میں بھی کیڑے پڑوائے۔

لتری' چور اور چکمہ باز ہونے کے علاوہ نانی پرلے درجہ کی جھوٹی بھی تھیں۔ سب سے بڑا جھوٹ تو ان کا وہ برقعہ تھا جو ہر دم ان کے اوپر سوار رہتا تھا۔ کبھی اس برقعہ میں نقاب بھی تھی۔ پر جوں جوں محلہ کے بڑے بوڑھے چل بسے یا نیم اندھے ہو گئے تو نانی نے نقاب کو خیرباد کہہ دیا۔ مگر گنگوروں دار فیشن ایبل برقعہ کی ٹوپی ان کی کھوپڑی پر چپکی رہتی۔ آگے چاہے مہین کرتے کے نیچے بنیان نہ ہو پر پیچھے برقعہ بادشاہوں کی جھول کی طرح لہراتا رہے اور یہ برقعہ صرف ستر ڈھانکنے کیلئے ہی نہیں تھا بلکہ دنیا کا ہر ممکن اور ناممکن کام اسی سے لیا جاتا تھا۔ اوڑھنے بچھانے اور گٹری مڑی کر کے تکیہ بنانے کے علاوہ جب نانی کبھی خیر سے نہاتیں تو اسے تولیہ کے طور پر استعمال کرتیں۔ پنج وقتہ نماز کیلئے جائے نماز اور جب محلہ کے کتے دانت نکوسیں تو ان سے بچاؤ کے لئے اچھی خاصی ڈھال۔ کتا پنڈلی پر لپکا اور نانی کے برقعہ کا گھیرا اس کے منہ پر پھنکارا۔ نانی کو برقعہ بہت پیارا تھا فرصت میں بیٹھ کر حسرت سے اس کے بڑھاپے پر بسورا کرتیں۔ جہاں کوئی چندی کتر ملی اور احتیاط" پیوند چپکا لیا۔ وہ اس دن کے خیال سے ہی لرز اٹھتی تھیں جب یہ برقعہ بھی چل بسے گا۔ آٹھ گز لٹھا کفن کو جڑ جاوے یہی بہت جانو۔

نانی کا کوئی مستقل ہیڈ کوارٹر نہیں۔ سپاہی جیسی زندگی ہے آج اس کے دلان میں تو کل اس کی صحنچی میں جہاں جگہ ملی پڑاؤ ڈال دیا۔ جب دھتکار پڑی کوچ کر کے آگے چل پڑیں۔ آدھا برقعہ اوڑھا آدھا بچھایا لمبی تان لی۔

مگر برقعہ سے بھی زیادہ وہ جس کی فکر میں گھلتی تھیں وہ تھی ان کی اکلوتی نواسی منی۔ کڑک مرغی کی طرح نانی پر پھیلائے اسے پوٹے تلے دابے رہتیں۔ کیا

مجال جو نظر سے اوجھل ہو جائے مگر جب ہاتھ پیروں نے جواب دے دیا اور محلّہ والے چوکنے ہو گئے ان کی جوتوں کی گھس گھس سن کر ہی چاق چوبند ہو کر مورچہ پر ڈٹ جاتے۔ ڈھٹائی سے نانی کے اشارے کنایہ سے مانگنے کو سنا ان سنا کر جاتے تو نانی کو اس کے سوا کوئی چارا نہ رہا کہ ننھی کو اس کے آبائی پیشے یعنی اوپر کے کام پر لگا دیں۔ بڑے سوچ بچار کے بعد انھوں نے اسے ڈپٹی صاحب کے یہاں روٹی کپڑا اور ڈیڑھ روپیہ مہینہ پر چھوڑ ہی دیا۔ پر وہ ہر دم سائے کی طرح لگی رہتیں۔ ننھی نظر سے اوجھل ہوئی اور وہ بلبلائیں۔ پر نصیب کا لکھا کہیں بوڑھے ہاتھوں سے مٹا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ڈپٹیائن، اپنے بھائی کے گھر بیٹے کا پیغام لے کر گئی ہوئی۔ سرکار خس خانہ میں قیلولہ فرما رہے تھے۔ ننھی پنکھے کی ڈوری تھامے اونگھ رہی تھی۔ پنکھا رک گیا اور سرکار کی نیند ٹوٹ گئی۔ شیطان جاگ اٹھا اور ننھی کی قسمت سو گئی۔

کہتے ہیں بڑھاپے کے آسیب سے بچنے کے لئے مختلف ادویات اور طلاؤں کے ساتھ حکیم بید چوزوں کی یخنی بھی تجویز فرماتے ہیں۔ نوبرس کی ننھی چوزہ ہی تو تھی۔

مگر جب ننھی کی نانی کی آنکھ کھلی تو ننھی غائب۔ محلّہ چھان مارا کوئی سراغ نہ ملا مگر رات کو جب نانی تھکی ماندی کوٹھری کو لوٹی تو کونے میں دیوار سے لگی ہوئی ننھی زخمی چڑیا کی طرح اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ نانی کی گھگی بندھ گئی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے وہ اسے گالیاں دینے لگی۔ "مالزادی اچھا چھکا۔ میاں آن کر مری ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے پنڈلیاں سوجھ گئیں۔ ٹھہر تو جا سرکار سے کیسی چار چوٹ کی مار لگواتی ہوں۔"

مگر ننھی کی چوٹ زیادہ دیر نہ چھپ سکی۔ نانی سر پر دوہتڑ مار مار کر چنگھاڑنے لگی۔ پڑوسن نے سنا تو سر پکڑ کر رہ گئیں۔ اگر صاحبزادے کی لغزش ہوتی تو شاید کچھ ڈانٹ ڈپٹ ہو جاتی۔ مگر ڈپٹی صاحب...... محلے کے مکھیا تین تو اسوھن کے نانا۔ پنجوقتہ نمازی۔ ابھی پچھلے دنوں مسجد میں چٹائیاں اور لوٹے رکھوائے۔ منبر سے

پھوٹنے والی بات نہیں۔

لوگوں کے رحم و کرم کی عادی نانی نے آنسو پی کر ننھی کی کمر سینکی آٹے گڑ کا حلوا کھلایا اور اپنی جان کو صبر کر کے بیٹھ رہی۔ دو چار دن لوٹ پیٹ کر ننھی اٹھ کھڑی ہوئی اور چند دنوں ہی میں سب کچھ بھول بھال گئی۔

مگر محلّہ کی شریف زادیاں نہ بھولیں۔ چھپ چھپ کر ننھی کو بلاتیں۔

"نئیں...... نانی مارے گی۔" ننھی ٹالتی۔

"لے یہ چوڑیاں پہن لیو۔ نانی کو کیا خبر ہو گی......" بیویاں بے قرار ہو کر پھسلاتیں......

"کیا ہوا...... کیسے ہوا......" کی تفصیل پوچھی جاتی۔ ننھی کچی پکی معصوم تفصیلیں دیتی۔ بیویاں ناکوں پر دوپٹے رکھ کر کھکھلاتیں۔

ننھی بھول گئی...... مگر قدرت نہ بھول سکی۔ کچی کلی قبل از وقت توڑ کر کھلانے سے پنکھڑیاں جھڑ جاتی ہیں...... ٹھونٹھ رہ جاتا ہے۔ ننھی کے چہرے پر سے بھی نہ جانے کتنی معصوم پنکھڑیاں جھڑ گئیں۔ چہرے پر پھٹکار اور روڑا پن۔ ننھی بچی سے لڑکی نہیں بلکہ چھلانگ مار کر ایک دم عورت بن گئی۔ وہ قدرت کے مشاق ہاتھوں کی سنواری بھرپور عورت نہیں بلکہ ٹیڑھی میڑھی مورت جس پر کسی دیو نے دو گز لمبا پاؤں رکھ دیا ہو۔ ٹھگنی موٹی کچورا سی جیسے کچی مٹی کا کھلونا کمہار کے گھٹنے تلے دب گیا ہو۔

میلی صافی سے کوئی ناک پونچھے چاہے کو لے، کون پوچھتا ہے۔ راہ چلتے اس کے چٹکیاں بھرتے۔ مٹھائی کے دونے پکڑاتے۔ ننھی کی آنکھوں میں شیطان تھرک اٹھتا...... مگر اب نانی بجائے اُسے حلوے ماڑے ٹھسانے کے اس کا دھوبی گھاٹ کرتی، مگر میلی صافی کی دھول بھی نہ جھڑتی۔ جانور بڑ کی گیند، پٹا کھایا اور اچھل گئی۔

چند سال ہی میں ننھی کی چوکھی سے محلّہ لرز اٹھا۔ سنا کہ ڈپٹی صاحب اور صاحبزادے میں کچھ تن گئی۔ پھر سنا مسجد کے ملاجی کو رجوا کمہار نے مارتے مارتے

چھوڑا۔ پھر سنا صدیق پہلوان کا بھانجہ مستقل ہو گیا۔

آئے دن ننھی کی ناک کٹتے کٹتے بچتی اور گلیوں میں لٹھ پونگا ہوتا۔

اور پھر ننھی کے تلوے جلنے لگے۔ پیر دھونے یک رتی بھر جگہ نہ رہی۔ صدیق پہلوان کے بھانجے کی پہلوانی اور ننھی کی جوانی نے محلّہ والوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ سنتے ہیں دلی' بمبئی میں اس مال کی تھوک میں کھپت ہے۔ شاید دونوں وہیں چلے گئے۔

جس دن ننھی بھاگی اس دن نانی کے فرشتوں کو بھی شبہ نہ ہوا۔ دو تین دن سے نگوڑی چپ چپ سی تھی۔ نانی سے یاد زبانی بھی نہ کی۔ چپ چاپ آپ ہی آپ بیٹھی ہوا میں گھورا کرتی۔

"اے ننھی روٹی کھالے۔" نانی کہتی۔

"نانی بی بھوک نہیں!"

"اے ننھی اب دیر ہو گئی سو جا۔"

"نانی بی نیند نہیں آتی۔"

رات کو نانی کے پیر دبانے لگی۔

"نانی بی...... اے نانی بی" سبحانک اللہم" سن لو یاد ہے کہ نہیں۔ نانی نے سنا فرفر یاد!"

"جا بیٹی اب سو جا۔" نانی نے کروٹ لے لی۔

"اری مرتی کیوں نہیں۔" نانی نے تھوڑی دیر بعد اسے صحن میں کھٹ پٹ کرتے سن کر کہا۔ کمبخت خانگی نے اب آنگن بھی پلید کرنا شروع کیا۔ کون حرامی ہے جسے آج گھر میں گھسا لائی ہے۔

پر صحن میں گھور گھور کر دیکھنے پر نانی سہم کر رہ گئی۔ ننھی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی اور صبح ننھی غائب ہو گئی۔

کبھی کوئی دور دیس سے آتا ہے تو خبر آ جاتی ہے کوئی کہتا ہے ننھی کو ایک بڑے نواب صاحب نے ڈال لیا ہے نم نم ہے منوں سونا ہے۔ بیگموں کی طرح رہتی ہے۔

کوئی کہتا ہے ہیرا منڈی میں دیکھا تھا۔

کوئی کہتا ہے فارس روڈ پر کسی نے اسے سونا گاچی میں دیکھا۔

مگر نانی کہتی ہے ننھی کو ہیضہ ہوا تھا۔ چار گھڑی لوٹ پوٹ کر مر گئی۔

ننھی کا سوگ منانے کے بعد نانی کچھ خبطن بھی ہو گئیں۔ لوگ راہ چلتے چھیڑ خانی کرتے۔

"اے نانی نکاح کر لو......" بھائی جان چھیڑتیں۔

"کس سے کلوں؟ لا اپنے خصم سے کرا دے۔" نانی بگڑتیں۔

"اے نانی ملا جی سے کر لو۔ اللہ قسم تم پر جان دیتے ہیں۔" اور نانی کی مغلظات شروع ہو جاتیں۔ وہ وہ چنترے گلیوں میں نکالتیں کہ لوگ بھونچکے رہ جاتے۔

"مل تو جائے بھڑوا...... ڈاڑھی نہ اکھیڑ لوں تو کہنا۔" مگر جب ملا جی کبھی گلی کے نکڑ پہ مل جاتے تو نانی سچ مچ شرما سی جاتیں۔

علاوہ محلّہ کے لڑکوں بالوں کے نانی کے ازلی دشمن تو موئے نگوڑے بندر تھے جو پیڑھیوں سے اسی محلے میں پلتے بڑھتے آئے تھے۔ جو ہر فرد کا کچا کٹھا جانتے تھے۔ مرد خطرناک ہوتے ہیں اور بچے بدذات عورتیں تو صرف ڈرپوک ہوتی ہیں۔ پر نانی بھی انہیں بندروں میں پل کر بڑھیائی تھیں۔ انہوں نے بندروں کو ڈرانے کے لئے کسی بچے کی غلیل ہتھیا لی تھی۔ اور سر پر برقعہ کا پگڑ باندھ کر وہ غلیل تان کر جب اچکتیں تو بندر تھوڑی دیر کو ششدر ضرور رہ جاتے اور پھر بے توجہی سے ٹہلنے لگتے۔

اور بندروں سے آئے دن ان کی باسی ٹکڑوں پر چخ چلتی رہتی۔ محلّہ میں جہاں کہیں شادی بیاہ چلا چالیسواں ہوتا' نانی جھوٹے ٹکڑوں کا ٹھیکہ لے لیتیں۔ لنگر خیرات بٹتی تو بھی چار چار مرتبہ چکمہ دے کر حصہ لیتیں۔ منوں کھانا بٹور لانے کے بعد وہ اسے حسرت سے تکتیں! کاش ان کے پیٹ میں بھی اللہ پاک نے کچھ اونٹ جیسا

انتظام کیا ہوتا تو کتنے مزے رہتے۔ مزے سے چار دن کی خوراک معدے میں بھر لیتیں چھٹی رہتی۔ مگر اللہ پاک نے رزق کا اتنا اوٹ پٹانگ انتظام کرنے کے بعد پیٹ کی مشین کیوں اس قدر ناقص بنا ڈالی کہ ایک دو وقت کے کھانے سے زیادہ ذخیرہ جمع کرنے کا ٹھور ٹھکانا نہیں۔ اس لئے نانی ٹاٹ کے بسیروں پر جھوٹے ٹکڑے پھیلا کر سکھاتیں پھر انہیں مٹکوں میں بھر لیتیں۔ جب بھوک لگی ذرا سے سوکھے ٹکڑے چومر کے پانی کا چھینٹا دیا چٹکی بھر لون مرچ پرکا اور لذیذ ملغوبہ تیار۔ لیکن گرمیوں اور برسات کے دنوں میں بارہا یہ نسخہ ان پر ہیضہ طاری کر چکا تھا۔ چنانچہ بن جانے پر طوعاً و کرہاً ان ٹکڑوں کو اونے پونے بیچ ڈالتیں تاکہ لوگ اپنے کتوں اور بکریوں وغیرہ کو کھلا دیں۔ مگر عموماً کتوں اور بکریوں کے معدے نانی کے ڈھیٹ معدے کا مقابلہ نہ کر پاتے اور لوگ مول تو کیا تحفتہ بھی ان فواکہات کو قبولنے پر تیار نہ ہوتے۔ وہی عزیز از جان جوٹھے ٹکڑے جنہیں بٹورنے کے لئے نانی کو ہزاروں صلواتیں اور ٹھوکریں سہنا پڑتیں اور جنہیں دھوپ میں سکھانے کے لئے انہیں پوری بندر جاتی سے جہاد مول لینا پڑتا۔ جہاں ٹکڑے پھیلائے گئے اور بندروں کے قبیلے کو بے تار برقی خبر پہنچی۔ اب کیا ہے غول در غول دیواروں پر ڈٹے بیٹھے ہیں۔ کھپریلوں پر دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ چھینا جھپٹ کھسوٹ رہے ہیں اور آتے جاتے پہ خوخیا رہے ہیں۔ نانی بھی اس وقت مرد میدان بنی سر پر برقعہ کا ڈھاٹا باندھے ہاتھ میں غلیل لئے مورچہ پر ڈٹ جاتیں۔ سارا دن "لگے۔ لگے" کر کے شام کو بچا کھچا کوڑا بٹور، بندروں کی جان کو کوستی نانی اپنی کوٹھری میں تھک کر سو رہتیں۔

بندروں کو ان سے کچھ ذاتی قسم کی پرخاش ہو گئی تھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیوں جہان بھر کی نعمتوں کو چھوڑ کر صرف نانی کے ٹکڑوں پر ہی حملہ آور ہوتے اور کیوں بدذات لال پچھاڑے والا ان ہی کا عزیز از جان تکیہ لے بھاگتا۔ وہ تکیہ جو ننھی کے بعد نانی کا واحد عزیز اور پیارا دنیا میں رہ گیا تھا وہ تکیہ جو برقعہ کے ساتھ ان کی جان پر ہمیشہ سوار رہتا تھا۔ جس کی سیونوں کو وہ ہر وقت پکا ٹانکہ مارتی رہتی تھیں۔ بارہا نانی کسی کونے کھدرے میں بیٹھی تکیہ سے ایسے کھیلا کرتیں جیسے وہ ننھی سی بچی

ہوں اور وہ تکیہ ان کی گڑیا' وہ اپنے سارے دکھ اس تکئے ہی سے کہہ کر جی ہلکا کر لیا کرتی تھیں۔ جتنا جتنا انہیں تکیہ پر لاڈ آتا وہ اس کے ٹانکے پکے کرتی جاتیں۔

قسمت کے کھیل دیکھیے نانی منڈیر سے لگی برقعہ کی آڑ میں نیفہ سے جوئیں چن رہی تھیں کہ بندر دھم سے کودا اور تکیہ لے یہ جا وہ جا۔ ایسا معلوم ہوا کہ کوئی نانی کا کلیجہ نوچ کر لے گیا۔ وہ دھاڑیں اور چلائیں کہ سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔

بندروں کا قاعدہ ہے کہ آنکھ بچی اور کٹورا گلاس لے بھاگے اور چھجے پر بیٹھے دونوں ہاتھوں سے کٹورا دیوار پر گھس رہے ہیں۔ کٹورے کا مالک نیچے کھڑا چمکار رہا ہے۔ پیاز دے روٹی دے جب بندر میاں کا پیٹ بھر گیا کٹورا پھینک اپنی راہ لی۔ نانی نے مٹھی بھر ٹکڑے لٹا دیئے پر حرامی بندر نے تکیہ نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔ سو جتن کئے گئے مگر اس کا جی نہ پگھلا۔ اور اس نے مزے سے تکیہ کے غلاف پیاز کے چھلکوں کی طرح اتارنے شروع کئے۔ وہی غلاف جنہیں نانی نے چندھی آنکھوں سے گھور گھور کر پکے ٹانکوں سے گوندھا تھا۔ جوں جوں غلاف اترتے جاتے نانی کی بدحواسی اور بلبلاہٹ میں زیادتی ہوتی جاتی اور آخری غلاف بھی اتر گیا۔ اور بندر نے ایک ایک کر کے چھجہ پر سے ٹپکانا شروع کئے۔ روئی کے گالے نہیں بلکہ شبن کی فتوئی۔ بنو بتے کا انگوچھا...... حسینہ بی کی انگیا...... منی بی کی گڑیا کا غرارہ۔ رحمت کی اوڑھنی اور خیراتی کا کچھنا......

خیرن کے لونڈے کا ضمنچہ...... منشی جی کا مفلر اور ابراہیم کی مقیش کی آستین معہ کف!

صدیق کی تہمد کا ٹکڑا۔ آمنہ بی کی سرمہ دانی اور بفاطن کی بجلونی۔ سکینہ بی کی افشاں کی ڈبیہ------ ملاجی کی تسبیح کا امام اور باقر میاں کی سجدہ گاہ۔

بسم اللہ کا سوکھا ہوا نال اور کلاوہ میں بندھی ہوئی ننھی کی پہلی سالگرہ کی ہلدی کی گانٹھ' دوب اور چاندی کا چھلا۔ اور بشیر خاں کا گلٹ کا تمغہ جو اسے جنگ سے زندہ لوٹ آنے پر سرکار عالیہ سے ملا تھا۔

مگر کسی نے ان چیزوں کو نہ دیکھا------ بس دیکھا تو اس چوری کے مال کو

جسے سالہا سال کی چھاپہ ماری کے بعد نانی نے لکھ لوٹ جوڑا تھا۔

"چور------ بے ایمان...... کمینی۔"

"نکالو بڑھیا کو محلے سے۔"

"پولیس میں دے دو۔"

"ارے اس کی توشک بھی کھولو اس میں نہ جانے کیا کیا ہو گا۔" غرض جو جس کے منہ میں آیا کہہ گیا۔

نانی کی چیخیں ایک دم رک گئیں۔ آنسو خشک۔ سر نیچا اور زبان گنگ! کاٹو تو خون نہیں۔ رات بھی جوں کی توں دونوں گھٹنے مٹھیوں میں دابے ہل ہل کر سوکھی سوکھی ہچکیاں لیتی رہیں کبھی اپنے ماں باپ کا نام لے کر کبھی میاں کو یاد کر کے کبھی بسم اللہ اور ننھی کو پکار کر بین کرتیں...... دم بھر کو اونگھ جاتی پھر جیسے پرانے ناسوروں میں چیونٹے چٹکنے لگتے اور وہ بلبلا کر چونک اٹھتیں۔ کبھی چپکی پھپکی روتیں کبھی خود سے باتیں کرنے لگتیں۔ پھر آپ ہی آپ مسکرا اٹھتیں اور پھر تاریکی میں سے کوئی پرانی یاد کا بھالا کھینچ مارتا اور وہ بیمار کتے کی طرح نیم انسانی آواز سے سارے محلے کو چونکا دیتیں۔ دو دن اسی حالت میں بیت گئے محلہ والوں کو آہستہ آہستہ احساس ندامت ہونا شروع ہوا۔ کسی کو بھی تو ان چیزوں کی اشد ضرورت نہ تھی۔ برسوں کی کھوئی چیزوں کو کبھی کا رو پیٹ کر بھول چکے تھے۔ وہ بیچارے خود کون سے لکھ پتی تھے۔ تنکے کا بوجھ بھی ایسے موقع پر انسان کو شہتیر کی طرح لگتا ہے۔ لوگ ان چیزوں کے بغیر زندہ تھے۔ شبن کی فتوئی اب سردیوں سے دھینگا مشتی کرنے کے قابل کہاں تھی، وہ اس کے ملنے کے انتظار میں اپنی بڑھوار تھوڑی روک بیٹھا تھا۔ حسینہ بی نے انگیا چولی کی اہمیت کو بیکار سمجھ کر اسے خیرباد کہہ دیا تھا۔ منی کی گڑیا کا غرارہ کس مصرف کا وہ تو کبھی کی گڑیوں کی عمر سے گزر کر ہنڈ کلیوں کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ محلے والوں کو نانی کی جان لینا تھوڑی منظور تھی۔

پرانے زمانہ میں ایک دیو تھا۔ اس دیو کی جان تھی ایک بھونرے میں۔ سات سمندر پار ایک غار میں ایک صندوق تھا۔ اس صندوق میں ایک صندوق اور

اس صندوق میں ایک ڈبیہ تھی جس میں ایک بھونرا تھا۔ ایک بہادر شہزادہ آیا...... اور اس نے پہلے بھونرے کی ایک ٹانگ توڑ دی، ادھر دیو کی ایک ٹانگ جادو کے زور سے ٹوٹ گئی پھر اس نے دوسری ٹانگ توڑی اور دیو کی دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی پھر اس نے بھونرے کو مسل ڈالا اور دیو مر گیا۔

نانی کی جان بھی تکیہ میں تھی اور بندر نے وہ جادو کا تکیہ دانتوں سے چیر ڈالا۔ اور نانی کے کلیجے میں گرم سلاخ اتر گئی۔

دنیا کا کوئی دکھ کوئی ذلت کوئی بدنامی ایسی نہ تھی جو نصیب نے نانی کو نہ بخشی ہو۔ جب سہاگ کی چوڑیوں پر پتھر گرا تھا تو سمجھی تھیں اب کوئی دن کی مہمان ہیں پر جب بسم اللہ کو کفن پہنانے لگیں تو یقین ہو گیا کہ اونٹ کی پیٹھ پر یہ آخری تنکا ہے اور جب ننھی منہ پر کالکھ لگا گئی تو نانی سمجھیں بس یہ آخری گھاؤ ہے۔

زمانہ بھر کی بیماریاں پیدائش کے وقت سے جھیلیں سات بار تو چیچک نے ان کی صورت پہ جھاڑو پھیری۔ ہر سال تیج تہوار کے موقع پر ہیضہ کا حملہ ہوتا۔

تیرا میرا گو موت دھوتے دھوتے انگلیوں کے پورے سڑ گئے۔ برتن مانجھتے ہتھیلیاں چھلنی ہو گئیں۔ ہر سال اندھیرے اجالے اونچی نیچی سیڑھیوں سے لڑھک پڑتیں۔ دو چار دن لوٹ پوٹ کر پھر گھسٹنے لگتیں۔ پچھلے جنم میں نانی ضرور کتے کی کلی رہی ہوں گی۔ جبھی تو اتنی سخت جان تھیں۔ موت کا کیا واسطہ جو ان کے قریب پھٹک جائے۔ بسریاں لگائے پھریں گی مگر مردہ کا کپڑا تن سے نہ چھو جائے۔ کہیں مرنے والا سلوٹوں میں موت نہ چھپا گیا ہو جو نازوں کی پالی نانی کو آن دبوچے! اگر یوں عاقبت بندروں کے ہاتھوں لٹے گی۔ اس کی کسے خبر تھی۔ صبح سویرے بہشتی مشک ڈالنے گیا تھا دیکھا نانی کھپریل کی سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہیں منہ کھلا ہے۔ مکھیاں نیم وا آنکھوں کے کونوں میں گھس رہی ہیں۔ یوں نانی کو سوتا دیکھ کر لوگ انہیں مردہ سمجھ کر ڈر جایا کرتے تھے۔ مگر نانی ہمیشہ بڑبڑا کر بلغم تھوکتی جاگ پڑتی تھیں اور ہونسنے والے کو ہزار صلواتیں سنا ڈالتی تھیں۔

" مگر اس دن سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہوئی نانی دنیا کو ایک مستقل گالی دے کر

چل بسیں! زندگی میں کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ کروٹ کروٹ کانٹے تھے۔ مرنے کے بعد کفن میں بھی نانی اکڑوں لٹائی گئی۔ ہزار کھینچ تان پر بھی اکڑا ہوا جسم سیدھا نہ ہوا۔

❁❁❁

شخصیات جنہوں نے مجھے متاثر کیا

سمجھ میں نہیں آتا اپنے متاثر ہونے کا الزام کس کے سر تھوپ دوں۔ ددھیال والوں کا خیال تھا کہ میں پورم پور اپنی ننھیال والوں پر گئی ہوں: نگوڑے شیخ، پتلی دال کھانے والے، مگر ننھیال والوں کو یقین تھا کہ میں سو فی صد ددھیال والوں پر پڑی ہوں: وہی اپنی پھوپھی جیسا تیہا اور گز بھر کی زبان۔ چنگیز خاں کی اولاد سے اور کیا امید کی جا سکتی ہے!

لیکن اگر کوئی میری اماں سے پوچھتا کہ بیٹی کو کیا ہو گیا تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں: "نہ ددھیال کا قصور نہ ننھیال کا۔ یہ سب نصیب کا پھیر ہے۔"

ایسی صورت میں کس کا نام لے دوں۔ وہ بیج جس سے میری ہستی وجود میں آئی قطعی ٹیڑھا میڑھا نہ تھا۔ ضرور پالنے پوسنے میں کہیں بھول چوک ہو گی۔

مگر مجھے بذات خود اس ماحول سے کوئی شکایت نہیں۔ جہاں میری تراش خراش ہوئی۔ کچر پچر بچوں کے جم غفیر میں ایک پاپیادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی۔ نہ لاڈ ہوئے نہ نخرے، نہ کبھی تعویذ گنڈے بندھے نہ نظر اتاری گئی، نہ کبھی خود کو کسی کی زندگی کا اہم حصہ محسوس کیا۔

بہنیں چونکہ بڑی نکل گئیں اسلیے بھائیوں کی صف میں جگہ ملی۔ کھیل کود کا زمانہ انہیں کے ساتھ گلی ڈنڈا، فٹ بال اور ہاکی کھیل کر گزرا۔ پڑھائی بھی ان کے ساتھ ہی ہوئی۔ سچ پوچھیے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے جن کی صحبت نے مجھے ان ہی کی طرح آزادی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ شرم و حیا جو عام طور پر درمیانے طبقے کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے پنپ نہ سکی۔ چھوٹی سی عمر سے دوپٹہ

اوڑھنا' جھک کر سلام کرنا' شادی بیاہ کے ذکر پر شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھیڑ کر پڑنے ہی نہ دی۔ سوائے عظیم بھائی کے سب ہی گھر میں چاق چوبند تھے۔ کنبے کا کنبہ حد درجہ باذاق اور باتونی۔ آپس میں چینیں چلتیں' نئے نئے جملے تراشے جاتے' ایک دوسرے کی دھجیاں اڑائی جاتیں' بچے بچے کی زبان سان پر رکھی تھی۔

ابا پنشن لے کر آگرے کے موروثی گھر میں رہنے لگے۔ کھلی ہوا میں اڑنے کے بعد ایک دم سے نہایت بوسیدہ ماحول کی گھٹن سے واسطہ پڑا۔ کہاں فٹ بال اور گلی ڈنڈا اور کہاں آگرہ محلہ پنجہ شاہی کی بوسیدہ گلیاں' اور ان گھٹی ہوئی گلیوں میں پلنے والی جھکی جھکی نیم مدقوق لڑکیاں جو اپنے دل کی دھڑکن سے سہم جاتیں۔ میری ان لڑکیوں سے بالکل نہ بنی اور ان بوڑھیوں سے بھی ٹھن گئی جو مجھے چھجوں پر قلانچیں بھرتا دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتیں:

"نوج بوا' نچھو کی لونڈیا ہے کہ موا بجار' توبہ توبہ!"

اور میری اماں جان' نصرت خانم' جنہیں لوگ پیار میں نچھو کہتے تھے' شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتیں۔

اور آگرے کی ان مردہ گلیوں میں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ عورت خدا نے کیوں پیدا کی' اس مری پٹی' مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت تھی؟ دھوبن روز رات کو پٹتی تھی۔ مہترانی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے۔ پاس پڑوس کی تمام عورتیں آئے دن اپنے شوہروں سے جوتے کھایا کرتی تھیں اور میں خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتی: اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنا دے کہ میں چھت پر پتنگ اڑانے پر نہ پٹوں' گلیوں میں کبڈی کھیل سکوں اور آزادی سے بندروں کے پیچھے بھاگتی پھروں۔ مگر آگرے میں گندی گلیاں ہی نہ تھیں ان گلیوں میں سارے دور اور قریب کے رشتے دار بھی رہتے تھے جن سے اماں لرزا کرتیں۔ جب تک دوسرے شہروں میں رہے آزاد رہے' اپنے کنبے میں آ کر تو جیسے بیڑیاں پڑ گئیں۔

مگر مجھے آگرے کی ان شرمیلی دبی لڑکیوں سے مجبوراً" بہناپا جوڑنا پڑا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ ظاہر میں بھولی نظر آنے والی لڑکیاں بڑی چلتا پرزہ ہیں۔ چھپ چھپ

کر وہ گل کھلائے جاتے ہیں کہ الٰہی توبہ۔ بڑھیوں کو چنکیوں میں الو بنا کر گلی کے لونڈوں سے خوب خوب پینگیں بڑھتی ہیں۔ مجھے اس دوغلی زندگی سے بڑی کراہت آئی۔

آگرے کی مکروہ فضا سے جلد ہی پیچھا چھوٹ گیا اور ہم لوگ علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ اماں کو بھی کچھ خاندان والوں سے وحشت سی ہوتی تھی۔ علی گڑھ کی کھلی ہوا میں پھر ہماری پرانی زندگی لوٹ آئی: وہی پھوس کے بنگلے' ڈگی کا کنارہ اور ہرے بھرے کھیت' اور ان کھیتوں میں ککڑیاں' کھیرے چرانا' پیڑوں پر چڑھنا۔۔ اور پھر مجھے اپنے لڑکی ہونے کا غم نہ رہا' بلکہ لڑکی ہونے کے کچھ فائدے نظر آنے لگے: مثلاً ابا کا حکم تھا کہ لڑکیوں کی چوٹی نہ کھینچی جائے اور نہ ان کی بالیوں میں انگلی ڈال کر جھٹکے دیے جائیں۔ لڑکیاں اگر ماریں تو سرکار سے شکایت کی جائے' مناسب سزا دی جائے گی۔ لڑکیاں کہاں بس خاکسار ہی ایک لڑکی تھی جس کی شکایتیں ابا حضور کے دربار میں آئے دن پیش کی جاتیں' مگر بھائی اتنے بدنام ہو چکے تھے کہ عموماً" ہمیں سزا نہ ملتی' الٹے وہی ڈانٹ دیے جاتے۔

علی گڑھ آ کر عظیم بھائی کے وجود کا احساس دن بدن بڑھنے لگا۔ خدا جانے انہیں مجھ سے کیوں ایک دم دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مجھے تو بڑے بھائی نسیم ہمیشہ سے اچھے لگتے تھے۔ ان سے مار کھانے میں بھی مزا آتا تھا' کیونکہ وہ پیسے اور مٹھائیاں بھی تو دیتے تھے۔ عظیم بھائی نہ پیسے دیتے تھے نہ چپتیں مارتے تھے' بڑی سنجیدگی سے بات کرتے۔

اور پھر انہوں نے مجھے تاریخ اور انگریزی پڑھانا شروع کی۔ یہ یاد نہیں رہا کہ ابتدا کیسے ہوئی' مگر اتنا یاد ہے کہ شام کو جب وہ کام سے تھکے ہارے آتے تھے تو اپنے برآمدے میں پلنگ پر لیٹ جاتے تھے اور مجھ سے کہتے زور زور سے پڑھو۔ پھر ترجمہ درست کرتے' املا لکھواتے' اس کے بعد باتیں کیا کرتے۔ یاد نہیں کیا باتیں تھیں جن سے ابتدا ہوئی' بعد میں تو حدیث و قرآن کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ ان کا پڑھانے کا طریقہ عجیب تھا: کوئی ناول دیتے کہ اس کا ترجمہ کر ڈالو' انگریزی

سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں۔ دس دس صفحے ترجمہ کروا ڈالتے۔ ناولوں کا ترجمہ کرنے میں کسی فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ پوری ناول کا ترجمہ کرنے سے پہلے ناول ختم کرنا پڑتی تھی' اور اسی زمانے سے مجھے شدت سے ناولیں پڑھنے کا چکر پڑ گیا۔ ساری ساری رات ناولیں' کہانیاں پڑھا کرتی۔ مگر اس زمانے میں میں نے جتنی ناولیں پڑھیں خاک پلے نہیں پڑا' لہٰذا پھر پڑھنا پڑیں۔ ہارڈی وہ پہلا ناولسٹ تھا جسے میں نے بقول عظیم بھائی گھول کر پی لیا۔

اس زمانے میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں بالکل ان کی آواز بازگشت بن گئی۔

"منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔" جب میں بولتی تو سب چڑاتے کہ یہ میں نہیں عظیم بھائی بول رہے ہیں' اور عظیم بھائی نے بھی میری ناسمجھی سے فائدہ اٹھایا۔ وہ بات' جو وہ خود نہ کہہ پاتے' بڑی ہوشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں پھٹ سے کہہ دیتی۔ اس دور میں بقول خاندان والوں کے انہوں نے مجھے خوب بھڑکایا۔ میری طبیعت' جو پہلے ہی خود سر اور ضدی تھی' ان کی شہ پاکر اور بھی قابو سے باہر ہو گئی۔

وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانے میں نوکری بھی کرتے تھے' مضمون بھی لکھا کرتے تھے۔ اس قدر محنت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی گھنٹے پڑھایا کرتے۔ کبھی حرارت ہوتی' کبھی سینے میں درد ہوتا' کبھی ہاتھ پیر اینٹھتے۔ ان کی بیوی بیٹی ان کی چھاتی سینکا کرتیں اور وہ مجھے پڑھایا کرتے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے سر یا پیر دبانے کو نہیں کہا اور میں نے بھی کبھی ان کا کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ بڑے بھائی جو تھے اس لیے مجھے پڑھانا تو ان کا فرض تھا۔ ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ دو گھنٹے ہو گئے اور چند صفحے کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا۔ مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

"ہم نہیں پڑھتے آپ سے' آپ اتنا تو کھانستے ہیں۔" میں نے جل کر کہا۔

"بے وقوف کہیں کی' کیا ہم جان بوجھ کر کھانس رہے ہیں۔" انہوں نے

ہنس کر کہا اور وعدہ کیا کہ اب نہیں کھانسیں گے۔

پتا نہیں انہیں میرے مستقبل سے کیوں دلچسپی ہو گئی تھی۔ میٹرک کرنے پر اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ چھٹیوں میں انہوں نے مجھے اپنے گھر بلا لیا۔ اب وہ جودھ پور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انہوں نے مجھے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی اور شاید کیا بلکہ قطعی میں نے ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی چھپا کر لکھنا شروع کر دیا۔ حجاب اسمٰعیل' مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سب کچھ میرے ہی اوپر بیت رہی ہے' اور پھر میں نے خود کو افسانے کی ہیروئن تصور کر کے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کیے۔

مثلاً میں بہت خوبصورت ہوں' بالکل حجاب اسمٰعیل کی ہیروئن کی طرح سنہری بال' نیلی آنکھیں' قرمزی رنگ کا لبادہ اوڑھے نیم دراز ہوں' ہیرو آتا ہے..... میرا پہلا ہیرو ہمیشہ ڈاکٹر ہوتا تھا۔ شاید اسلئے کہ اس زمانے میں ڈاکٹر ہی ایسا غیر مرد ہوتا تھا جو گھر میں آکر نبض ٹٹول سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر لازمی طور پر بہت حسین ہوتا تھا۔ رات بھر میرے سرہانے بیٹھا رہتا۔ میری حالت خراب ہونے پر زار و قطار روتا' بے تابانہ مجھے چومتا اور میری حسین موت پر دھاڑیں مار کر روتا اور عموماً" خودکشی کر لیتا۔ کیا مزے دار ہوا کرتی تھیں یہ کہانیاں۔ انہیں لکھنے میں اتنا ہی لطف آتا تھا جیسا چٹ پٹی کہانیاں پڑھنے میں آتا ہے۔ جیسے رومانی ناول میں جب ہیرو ہیروئن کے لبوں کا بوسہ لیتا ہے تو پڑھنے والے کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں یہی حال لکھنے میں بھی ہوتا ہے۔ عموماً" ایسی کہانیاں لکھ کر میں فوراً پھاڑ ڈالا کرتی کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ "گندی" ہیں اور اگر کسی نے پڑھ لیں تو وہ جوتا کاری ہو گی کہ بس۔

مگر نہ جانے کیوں پھر لکھ کر دوبارہ پڑھنے میں لطف آتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے میں نے نہیں کسی اور نے لکھی ہیں' اور واقعی وہ میری تصنیف نہ تھیں اور نہ میرا روزنامچہ تھیں بلکہ وہ ان کہانیوں کا نچوڑ تھیں جو مجھے بہکا چکی تھیں۔

ایسی کہانیوں کا میرے سرہانے انبار جمع ہو گیا اور وہی ہوا جس کا مجھے خوف

تھا۔

ایک دن شمیم، جو عمر میں مجھ سے سال ڈیڑھ سال بڑے ہیں، میرے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سرہانے کاغذ سرسرائے تو نکال کر پڑھنے لگے۔

"آہا! بھئی نے کیا گندی گندی باتیں لکھی ہیں، توبہ توبہ!"

شمیم سور نے زور زور سے پڑھنا شروع کیا:

"ڈاکٹر جمیل نے اپنا سفید براق ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور میرے گلابی ہونٹ......"

میں پاس ہی غسل خانے میں نہا رہی تھی، سر میں بیسن ڈال چکی تھی، اُفوہ! بیان نہیں کر سکتی کیا حالت ہوئی۔ یا خدا، اگر ایک سطر اور آگے پڑھ لی تو پھر ڈوب مرنے کے سوا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔

ہیبت زدہ ہو کر میں نے غسل خانے ہی سے وہ زور زور کی چیخیں ماریں کہ سارا گھر ہل گیا۔ لوگ سمجھے شاید موری سے سانپ نکل آیا ور مجھے ڈس لیا۔ شمیم بے چارا کاغذ پھینک پھانک کر میری جان کی خیر منانے لگا۔ میں نے الٹے سیدھے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر شمیم کا منہ نوچ ڈالا۔ وہ بے چارا ہونق منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ آگے اسے پڑھنے کا ہوش ہی نہ رہا۔ وہ خود میری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میں نے اسی وقت سارا پلندہ جلا کر خاک کر دیا۔ شمیم نے بہت کہنے کی کوشش کی کہ میں نے نہایت گندی کہانیاں لکھی تھیں مگر میں نے جھٹلا دیا کہ ترجمہ تھا۔ وہ بے چارا پرلے درجے کا جھوٹا مشہور تھا اس لیے کسی نے بھی نوٹس نہ لیا۔

اب بھی اس خیال سے کوفت ہوتی ہے کہ اگر بجائے شمیم کے کوئی دوسرا بھائی پڑھ لیتا تو واقعی قیامت آ جاتی۔ بس اس دن سے میں نے توبہ کی کہ اول تو ایسی بے ہودہ کہانیاں لکھوں گی ہی نہیں، جو اگر لکھیں بھی تو فوراً پھاڑ ڈالوں گی۔ حالانکہ اب اگر غور کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ ان کہانیوں میں تو کچھ بھی نہ تھا سوائے اوپری چوما چاٹی کے، جو مجھے نہایت پھس پھسی لگنے لگی تھی۔

پھر کئی سال کچھ نہیں لکھا۔ بی۔ اے کے بعد دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ چار

سال میں انسان کتنا بڑا ہو جاتا ہے! میٹرک کے بعد چار سال میں نے نصاب کی کتابیں مجبوراً پڑھیں۔ یونانی ڈراما اور شیکسپیئر سے لے کر ابسن اور برنارڈ شا تک بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ برنارڈ شا نے میرا دل مٹھی میں لے لیا۔ میں نے اپنا پہلا مضمون یا ڈراما "فسادی" برنارڈ شا سے حد درجہ متاثر ہو کر لکھا۔ مواد میں نے اپنے اردگرد سے لیا اور اینٹ گارا برنارڈ شا سے۔ بی۔ ٹی کلاس میں میری ہم جماعت عذرا حیدر مجھے برنارڈ شا کہہ کر خوب چڑایا کرتی اسلئے میں نے فوراً برنارڈ شا کے شکنجے سے نکل کر کہانیاں لکھنا شروع کیں۔

اور زندگی کے اس دور میں مجھے ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا موقع ملا جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا: روشن آنکھوں اور مسکراتے، شگفتہ چہرے والی رشیدہ آپا سے کون ایسا تھا کہ ایک دفعہ مل کر بھنا نہ جائے۔

پہلی دفعہ میں نے انہیں نہ جانے کون سے جلسے میں دیکھا تھا۔ بیگم بھوپال صدارت کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کڑکڑاتے جاڑے میں بیویاں موٹے موٹے دوشالے اور کوٹ ڈانٹے پنڈال کے اندر سوں سوں کر رہی تھیں اور رشیدہ آپا بغیر آستین کا بلاؤز پہنے دھواں دھار کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کے سیاہ بھونرا اور گھونگریالے بال ہوا میں اڑ رہے تھے کیونکہ تقریر شروع کرنے سے پہلے انہوں نے سامنے کی کھڑکی کھول دی تھی۔ بیویاں بڑبڑا رہی تھیں: ان کے کٹے ہوئے بالوں پر، بغیر آستین کی بلاؤز پر، اور کھلی ہوئی کھڑکی سے آتی ہوئی ہوا پر، مگر ان کی تقریر بھی شاید کچھ کم خاردار نہیں تھی کیونکہ تقریر کے بعد انہیں بیگم بھوپال نے خوب ڈانٹا۔ اس دن ان کی بے حیائی اور بے باکی کا تہلکہ مچ گیا تھا اور میں نے بے سمجھے بوجھے ان کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر چن لیا تھا۔

۳۸ء میں رشیدہ آپا انگاروں والی رشید جہاں بن چکی تھیں۔ اب ان کی سلگتی ہوئی باتیں پلے بھی پڑنے لگی تھیں۔

اور پھر وہ میرا حسین ڈاکٹر ہیرو، شمعی انگلیاں، نارنگی کے شگوفے اور قرمزی لبادے چھو ہو گئے۔ مٹی سے بنی ہوئی رشیدہ آپا نے سنگ مرمر کے سارے بت

منہدم کر دیے۔

زندگی ننگی چم سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ان سے گھنٹوں باتیں کر کے بھی جی سیر نہ ہوتا۔ جی چاہتا انہیں کھا جاؤں۔ کیا کروں؟ جو رشیدہ آپا سے مل چکے ہیں‘ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں‘ اگر وہ میری کہانیوں کی ہیروئن سے ملیں تو دونوں جڑواں بہنیں نظر آئیں کیونکہ انجانے طور پر میں نے رشیدہ آپا ہی کو اٹھا کر افسانوں کے طاقچے میں بٹھا دیا کہ میرے تصور کی دنیا کی ہیروئن وہی ہو سکتی تھیں۔ مگر جب غور سے اپنی کہانیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے صرف انکی بے باکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لیا‘ ان کی بھرپور سیمابی شخصیت میری قابو میں نہ آئی۔ مجھے روتی بسورتی‘ حرام کے بچے جنتی‘ ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی وفا اور وہ جملہ خوبیاں‘ جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں‘ مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔ عشق میں محبوب کی جان کا لاگو ہو جانا‘ خود کشی کرنا‘ واویلا کرنا میرے مذہب میں جائز نہیں۔ عشق مقوی دل و دماغ ہے نہ کہ جی کا روگ۔

یہ سب میں نے رشیدہ آپا سے سیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ رشیدہ آپا جیسی لڑکی سو لڑکیوں پر بھاری پڑ سکتی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد سوائے فسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا۔ ملک بکھرا‘ دنیا بکھری اور اس کے ساتھ کتنی ہی حسین و نازک قدریں چور چور ہو گئیں۔ مقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑبڑا دیا۔ کیوں لکھیں اور کیا لکھیں کے مخمصے میں پڑ کر اور بھی راستہ گم ہو گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹا دیا۔ کتنے نئے ساتھی ملے اور پرانے بچھڑ گئے۔ اور پھر وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔

انجمن کے پرخچے اڑ گئے۔ بمبئی گروپ‘ جس کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھا کرتی تھیں‘ فلموں میں غرق ہو گیا۔ ظاہر ہے صرف رسالوں کیلئے لکھ کر روزی

نہیں کمائی جا سکتی‘ نہ ناولوں اور افسانوں کے مجموعوں سے بمبئی کا خرچہ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ہاتھ لگ جائے تو قلم چلا کر روٹی کا سہارا ہو سکتا ہے۔

فلموں کیلئے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بے باکی کی دھونس چلتی ہے اور نہ صاف گوئی کام آتی ہے‘ یہاں تو وہ ہر چیز چاہئے جو چھپر پھاڑ کر دولت لائے‘ یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہو گا—— لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

فسادات کے بارے میں تجربہ سنی سنائی سے آگے نہ بڑھ پایا۔ ”دھانی بانکیں“ اور ”جڑیں“ سے زیادہ نہ محسوس کر پائی اور نہ لکھ پائی‘ مگر ان دو مضامین کو لکھتے وقت میرے دل نے بڑے زور کی قلابازی لگائی۔ اس وقت تک میں نے جتنی کہانیاں لکھی تھیں ان میں ماں باپ یا تو تھے ہی نہیں‘ اگر تھے تو نہایت فضول سی شے۔ انہیں نظر انداز کر کے ہی میری دانست میں ان پر فتح پائی جا سکتی تھی۔ والدین سڑک کا روڑا ہی تو ہیں جو اولاد کے راستے میں رکاوٹ کے سوا کچھ نہیں پیدا کرتے۔ ”یہ نہ کرو‘ وہ نہ کرو“ اب تک میرے دماغ میں بسا ہوا تھا‘ لیکن یہ دو مضمون لکھتے وقت میں نے اپنی ماں کو دیکھا۔

سب انہیں اکیلا چھوڑ کر پاکستان جا چکے تھے۔ میں ان سے ملنے جودھ پور گئی۔ اماں ہمارے ذاتی مکان کے سامنے ایک مختصر سے کمرے میں منتقل ہو گئی تھیں۔ ہمارا اپنا وسیع مکان رفیوجیوں کے قبضے میں تھا۔

میں پہنچی تو ڈھنڈار اجڑے ہوئے کمرے میں میری اماں بیٹھی تھیں۔ اماں کو ہم لوگوں کو چومنے چاٹنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔ مجھے نہیں یاد اس سے پہلے کبھی انہوں نے محبت کا اظہار کیا ہو‘ مگر اس وقت مجھے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اپنے قیام کے زمانے میں بار بار میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑکی سے اپنے گھر کو تک رہی ہیں جہاں بھرے پرے خاندان کے ساتھ ہم سب ہنسی خوشی رہتے تھے‘ بچے قلانچیں بھرتے تھے‘ لڑائیاں ہوتی تھیں‘ ملاپ ہوتے

تھے۔

میں نے ان کی عمر کی طرف دیکھا' اس اکیلے پن کو دیکھا: موٹے تازے دس بچے پیدا کر کے بھی وہ اکیلی تھیں۔

میرے دل میں پیار کا طوفان ابل آیا' ماتا جاگ اٹھی۔ میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا' پھر اپنی بچی کی طرف دیکھا' اور ان دو ہستیوں کے بیچ میں خود کو جکڑا ہوا پایا۔ اپنی ماں کو دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ ساری دنیا کی بڑھیوں پر پیار آنے لگا جو دنیا کو بساتی ہیں' مر مر کر جنم دیتی ہیں' انہیں پالتی پوستی ہیں' جو کچھ ان پر نچھاور کرتی ہیں نہ ان سے اشٹامپ لکھاتی ہیں نہ پکے کاغذ پر رسید۔ اب اگر اولاد ان کے بڑھاپے کا خیال کرے تو فرمانبردار ہے' جو اپنے بال بچوں کے خرچے سے کچھ نہ بچے تو مجبور ہے۔ پرانے زمانے میں بڑے بوڑھوں کو لوگ بیکار جنس سمجھ کر زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ یہ سنسان بڑھاپا کس قدر مہیب شے ہے!

اور یہ بھی اتفاق ہی تھا جو میری اپنی ماں سے ملاقات ہو گئی اور کچھ سوئے ہوئے تار جاگ اٹھے۔ ابھی کتنے تار ہیں جو مردہ' خاموش' سوئے پڑے ہیں۔ کون جانے کون سے نئے مضراب اور پیدا ہوں گے جن کی چوٹ سے بہت سی نیندیں ٹوٹیں گی۔ ٹھہرے ہوئے پانی پر کائی جم جاتی ہے' ایک ننھا سا کنکر سطح پر گرا ہے' کائی چھٹ جاتی ہے۔۔۔ جگمگاتی دنیا کا عکس پانی کی سطح پر لودینے لگتا ہے' انسان ایک قدم آگے بڑھاتا ہے!

2055

عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پر پیچ اور دشوار گزار نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ افسانے اس جوہر سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے ظاہر میں ہے' اس کے باطن میں ہے۔

(کرشن چندر)

عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں۔ کہ جب تک وہ کھڑی تھیں' کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے اردو ادب میں جو امتیاز عصمت چغتائی کو حاصل ہے' اس کا منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہو گا۔

(پطرس بخاری)

RB
RHOTAS BOOKS
Ahmed Chambers 5 Temple Road Lahore
Rs. 30/=